سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اُردو شمارہ (۳۲)

میر محمد مومن

یعنی

پیشوائے سلطنتِ قطب شاہیہ، سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم حیدرآباد کے مشہور تعمیر کار اور مصلح، اور بانئ "دائرہ میر مومن" کے حالاتِ زندگی اور علمی و رفاہی و سیاسی کارناموں کا مفصل تذکرہ

مولفۂ

سید محی الدین قادری زور

حیدرآباد سنہ ۱۹۴۱ء

بار اول
تعداد صفحات (۳۱۲)
تعداد تصاویر (۳۴)
قیمت دو روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ :- سب رس، کتاب گھر- خیرت آباد حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد

فہرست مندرجات

دیباچہ

(صفحات ۱۱ تا ۱۴)

پہلا حصہ

ابتدائی حالات

(صفحات ۱۵ تا ۳۰)

دوسرا حصہ

پیشوائی محمد قلی قطب شاہ

(صفحات ۳۱ تا ۶۲)

تیسرا حصہ

دیہات اور جاگیرات

(۶۳ تا ۱۰۶)

چوتھا حصہ

پیشوائی سلطان محمد قطب شاہ

(۱۰۷ تا ۱۵۸)

پانچواں حصہ
خانگی زندگی
(۱۵۹ تا ۱۸۴)

چھٹا حصہ
تصنیف و تالیف
(۱۸۵ تا ۲۲۶)

ساتواں حصہ

تصرفات

(۲۲۷ تا ۲۴۶)

اٹھواں حصہ

پس ماندگاں

(۲۴۷ تا ۲۶۶)

نواں حصہ

دائرہ

(۲۶۷ تا ۲۹۲)

دسواں حصہ

ضمیمے

(۲۹۳ تا ۳۱۲)

تصویروں اور نقشوں کی فہرست

دیباچہ

میر محمد مومن کی زندگی کے حالات ان لوگوں کے لئے ہمیشہ دلیل راہ ثابت ہوں گے جو دنیوی جاہ واقتدار کے ساتھ ساتھ حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کا پورا لحاظ رکھنا چاہتے ہیں۔ دولت، عزت اور اعلیٰ اقتدار یہ تینوں نعمتیں شاید ہی ایک جگہ جمع ہوتی ہوں! اور بخت و اتفاق سے جب کبھی کسی کو حاصل ہوجاتی ہیں تو اس کے قلب و دماغ کی قوتیں اکثر و بیشتر گمراہی کی طرف راغب ہونے لگتی ہیں۔ لیکن میر مومن ایک ایسے خوش بخت انسان تھے جو اپنا کردار آخر تک پاک و صاف رکھ سکے۔ اور ثابت کر دکھایا کہ مردانِ باصفا دولت واقتدار کی فراوانیوں کے باوجود بھی مست نہیں ہوتے۔

"حیاتِ محمد قلی قطب شاہ" کی ترتیب کے وقت جب دکن کے اس رفیع المرتبت حکمران کے وزراء وامراء کے حالات قلمبند کرنے پڑے تو معلوم ہوا کہ اس بادشاہ کی زندگی اور دورِ حکومت کی تعمیر میں اس کے وزیرِ اعظم اور پیشوا میر محمد مومن کے مساعی جمیلہ کو بہت بڑا دخل ہے۔ اور یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر ایک علحدہ کتاب لکھی جائے۔ اس لئے حیات محمد قلی میں اس پیشوائے اعظم کے حالات پر ایک مختصر سا نوٹ لکھ کر یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ آئندہ اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب شائع کی جائے گی۔

خدا کا شکر ہے کہ تقریباً دو سال کی کدوکاوش کے بعد آج اس وعدہ کے ایفاء کا موقع ملا اور میر محمد مومن کے حالات زندگی ہر ممکنہ ذریعے سے حاصل کر کے ان صفحات میں یکجا کر دئیے گئے۔ فراہمی مواد کے لئے کتب خانوں کی چھان بین کے علاوہ شہر کے اطراف واکناف کے دیہات میں سیکڑوں میل کا سفر کیا گیا۔ اور میر صاحب کے بنائے ہوئے تالابوں، مسجدوں اور آبادیوں کے معاینہ کی خاطر ایسے ایسے مقامات تک بھی پہنچنا پڑا، جہاں شاید ہی اس سے پہلے موٹر کی رسائی ہوئی ہو۔ اور بعض جگہ تو سواری چھوڑ کر دور دور تک پیدل جانا پڑا۔ بہرحال خوشی اس کی ہے کہ توقع سے زیادہ معلومات فراہم ہوگئیں اور میر مومن کی حیات اور کارناموں کی نسبت ایک ایسی کتاب تیار ہوسکی جس کی تکمیل بجائے خود ایک بہت بڑا انعام ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ایک رفیع المرتبت شخصیت کی پاک اور کامیاب زندگی کی نسبت سبق آموز معلومات کی فراہمی کے علاوہ اس امر کا بھی علم ہوگا کہ تاریخ ہند کے کتنے پہلو ابھی منظر عام پر آنے ہیں۔ جب تک مملکت دکن کا پس منظر اور وہ مساعی پیش نظر نہ ہوں گے جنہوں نے اس ملک کو تہذیب و شائستگی اور بین قومی اتحاد و رواداری کا مرکز بنا دیا تھا اُس وقت تک موجودہ نسلیں سیاسی گتھیوں میں الجھی رہیں گی۔ ہر ملک کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور اگرچہ اب بعض لوگ اس مقولہ کے قائل نہیں رہے کہ "تاریخ اپنے حالات و واقعات کو دہراتی رہتی ہے"، تاہم نت نئے مسائل کو سلجھانے کے لئے گذشتہ کے تجربے اور مختلف افراد اور طبقوں کی نسلی اور عمرانی معلومات ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔



حضرت میر محمد مومن

عہد حاضر میں حیدرآباد اور ہندوستان تو کجا سارا عالم ایک سیاسی ہیجان میں مبتلا ہے اور انقلابی دور سے گذر رہا ہے اور ظاہر ہے کہ ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایسے انقلابی دور بارہا آتے اور گذر جاتے ہیں۔ اور ہر وقت اپنے پیچھے نئے اثرات چھوڑ جاتے ہیں لیکن آندھیوں میں باعظمت اسلاف کے کارنامے فنا نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ نئے محرکات اور رجحانات کچھ دنوں کے لئے ان کی اہمیت بدل دیں۔ تاہم یقین ہے کہ نئی نسلیں اُن کے زیر اثر امن و اطمنان اور شائستگی کی ایک نئی کروٹ لیتی ہیں۔

جو قوم اپنے بزرگوں کے سرمایے اور تجربے سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتی وہ زندگی کی دوڑ میں اپنے حریفوں سے پیچھے رہ جاتی ہے اور میر محمد مومن جیسے بزرگوں کے کارنامے تو تاریک سے تاریک ماحول میں بھی ایسے بلند ماروں کا کام دے جاتے ہیں جن کی روشنی سے بھٹکے ہوئے قافلوں کی منزلِ مقصود کی طرف رہبری ہوتی ہے۔

میر محمد مومن کی زندگی عہد حاضر میں بھی ان لوگوں کے لئے ایک نمونے کا کام دے سکتی ہے جو اپنی قدیم عظمت اور گم شدہ فوقیت کے حصول میں کوشاں ہیں۔

گولکنڈہ اور حیدرآباد کی چارسو سالہ تاریخ میں میر محمد مومن جیسے اور بھی بیسیوں ارباب فضل و کمال کے کارنامے پوشیدہ ہیں۔ ان کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کتاب اور اس کے علاوہ "حیات محمد قلی قطب شاہ" اور نیم تاریخی افسانوں کے مجموعوں "گولکنڈے کے ہیرے" اور "سیر گولکنڈہ" کی ترتیب سے مولف کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس قسم کے ضروری موضوعوں کی طرف لوگ متوجہ ہوں۔ اور ملک کی شائستگی اور رواداری کے قدیم ترین اسباق کا اعادہ کریں

موجودہ سیاسی اور فرقہ واری کشمکشوں کے تصفیے میں اس آموختے سے یقیناً مدد ملے گی !

آخر میں ان اصحاب (اور خاص کر نواب سالار جنگ بہادر ، مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی مولوی سید محمد صاحب، مولوی سید محمد تقی صاحب، مولوی میر عباس علی صاحب ، مولوی صدیق علی صاحب مولوی عبدالرشید صاحب اور مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی) کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے ، جن سے اس کتاب کی ترتیب میں مولف کو کسی نہ کسی طرح کی مدد ملی ۔

رفعت منزل
یکم جمادی الثانی ۱۳۶۰ ہجری

سید محی الدین قادری زور

پہلا حصہ

ابتدائی حالات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام اور لقب اصل نام میر محمد مومن تھا۔ اور عام طور پر میر صاحب یا میر مومن صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔ شاہ عباس صفوی نے جب محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کی تعزیت اور سلطان محمد کی تخت نشینی (سنہ ۱۰۲۰ھ) کی تہنیت کیلئے اپنے سفیر حسین بیگ قبچاقی کو حیدر آباد روانہ کیا تو ایک فرمان میر صاحب کے نام بھی علیحدہ ارسال کیا تھا اور اس میں ان کا نام امیر محمد مومنا، استر آبادی لکھا ہے[1]۔

میر صاحب نے قطب شاہی سلطنت میں اگرچہ انتہائی عروج و اقتدار حاصل کیا تھا اور دو بادشاہوں کے عہد میں پیشوائے سلطنت اور مختار کل رہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خطاب قبول نہیں کیا۔ قطب شاہی تاریخوں میں ان کو حسب ذیل القاب سے یاد کیا گیا ہے:۔

۱۔ نواب علامی فہامی پیشوائے عالمیان میر محمد مومن[2]۔

۲۔ نواب علامی فہامی مرتضائے ممالک اسلام میر محمد مومن[3]۔

۳۔ نواب مرتضائے ممالک اسلام میر محمد مومن[4]

---

[1] دیکھو حدائق السلاطین ورق ۱۹۲ ب — [2] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۷ — [3] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹ — [4] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹ و جلد دوم قلمی در ضمن حالات سنہ ۱۰۵۳ھ۔

۴۔ نواب علامی فہامی میر محمد مومن[۱]

۵۔ جناب نقابت مآب[۲]

۶۔ جناب سیادت ونقابت پناہ علامی فہامی میر محمد مومن استر آبادی[۳]

۷۔ جناب سیادت منزلت، مہر سپہر فضل وعزت، پیشوائے عالمیان، المؤید بتائید المہیمن میر محمد مومن[۴]

۸۔ نواب علامی فہامی پیشوائے اہل ایمان میر محمد مومن[۵]

۹۔ حضرت سیادت ونقابت پناہ علامی میر محمد مومن[۶]

۱۰۔ عالی حضرت سیادت مرتبت، مشتری منزلت، خورشید اوج فضل وکمال، مہر سپہر عزت واقبال، مرتضائے ممالک اسلام، مقتدائے طوایف انام، الواثق بتائید المہیمن میر محمد مومن، رکن السلطنت وپیشوائے این دولت خانہ[۷]۔

۱۱۔ زبدہ وپیشوائے حضرت رسالت میر محمد مومن[۸]

۱۲۔ حضرت سیادت ونقابت دستگاہ مرتضائے ممالک اسلام[۹]

شاہ ایران نے اپنے مذکورہ فرمان میں ان کے لئے حسب ذیل القاب لکھے ہیں :۔

سیادت ونقابت پناہ، افادت وافاضت دستگاہ، مستجمع الفضائل والکمالات، شمساً للسیادۃ

۱؎ حدیقۃ السلاطین صفحہ ۲۰ وجلد دوم قلمی درضمن حالات ۱۰۳۵ھ۔ ۲؎ حدائق ورق ۱۹۱ ا۔ ۳؎ حدیقۃ العالم صفحہ ۲۶۴

۴؎ حدیقۃ العالم صفحہ ۲۶۶۔ ۵؎ حدیقۃ العالم صفحہ ۲۷۴۔ ۶؎ تاریخ محمد قطب شاہی ورق ۲۸۵ ب۔ ۷؎ تاریخ محمد قطب شاہی ورق ۲۸۷ ا۔ ۸؎ تاریخ محمد قطب شاہی ورق ۲۸۹ ا۔ ۹؎ تاریخ محمد قطب شاہی ورق ۳۰۱ ا۔

والنقابۃ والدین[1]۔

عبداللہ قطب شاہ نے ان کی وفات کے پندرہ سال بعد ان کی جاگیرات وغیرہ کی بحالی کے سلسلہ میں جو فرمان ۱۰۵۰ھ میں نافذ کیا اس میں ان کے یہ القاب درج کئے ہیں :۔

" سیادت ونجابت پناہ ' افادت وافاضت دستگاہ ' قدوۃ المحققین اسوۃ المدققین ' مرتضی ممالک اسلام ' مقتدائے طوایف انام ' خلاصۂ اولادِ رسول ' زبدۂ احفادِ بتول[2] "

میر صاحب نے ایک رسالہ مقداریہ لکھا تھا جس کے دو تین نسخوں کا اُس وقت تک پتہ چلا ہے لیکن نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں اِس کا ایک ایسا اہم نسخہ ہے جو خود میر مومن صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ اِس کے سرورق پر محمد قطب شاہ کی مہر کے ساتھ میر صاحب کا نام اِس طرح لکھا ہے :۔

" تصنیف میر مومن پیشوا[3] "

اسی طرح میر مومن صاحب کے نبیرہ سید محمد نے اپنے ایک محضر مورخہ ۱۱۶۰ھ میں ان کا نام اس طرح لکھا ہے :۔

جنت مکانی فردوس آشیانی میر محمد مومن پیشوائے قطب الملک[4]۔

اِن تمام تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر محمد مومن اپنے نام کے علاوہ نواب علامی فہامی اور مرتضائے ممالک اسلام اور پیشوا کے القاب سے عام طور پر یاد کئے جاتے تھے ۔ اور دونوں بادشاہ ہوں کے

---

[1] حدایق ۱۹۲ ب ۔ [2] مرقع ادارۂ ادبیات اُردو نمبر ۸ ورق ۵ ۔ [3] مرقع ادارۂ ادبیات اُردو نمبر ۸ ورق ۲ ۔ [4] اس محضر کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں درج ہے ۔

زمانے یعنے تقریباً چالیس سال کی طویل عزت وعظمت اور پیشوائی ووکالتِ مطلق کے باوجود اپنے لئے کوئی خطاب قبول نہیں کیا تھا۔

خاندان اور والدین

میر صاحب کے خاندان کا تعلق استر آباد کے مشاہیر سادات سے تھا سلاطین وامرائے ایران ان کے آباو اجداد کی بڑی عزت کرتے تھے۔
تاریخ عالم آرائے عباسی میں (جو میر صاحب ہی کی زندگی میں لکھی گئی تھی) لکھا ہے:۔

"از سادات عظام استر آباد" (مطبوعہ ایران صفحہ ۱۵۹)

فرشتہ لکھتا ہے:۔

"آباءً واجداداً از دسلاطین ایران معزز ومکرم بودند" ص۱۷۳

گلزار آصفی میں لکھا ہے:۔

"بزرگانِ آں جناب ہم در دیار ایران مخدوم پادشاہان عالی تبار بودہ اند۔ وبخدمات شایستہ جلیل القدر مدار المہامی ووزارت معمور ماندند۔"

میر صاحب کے والد کا نام سید علی شرف الدین سماکی تھا۔ لیکن خود ان کے قلم سے لکھا ہوا جو رسالہ مقداریہ اسوقت موجود ہے اسمیں انھوں نے اپنا اور اپنے والد کا نام اس طرح لکھا ہے:۔

"عبد مامور محمد مومن بن علی الحسینی عفی عنہما"[1]

دوسری قدیم کتابوں میں ان کے والد کا نام کہیں درج نہیں البتہ محبوب الزمن میں لکھا ہے:۔

---

[1] مرقع ادارہ نمبر ۸ ورق ۳۔

"میر مومن نام سید شرف الدین ساکی کے فرزند"[۱] ۔

تعجب ہے کہ خود میر صاحب نے اپنے والد کے نام کے ساتھ شرف الدین نہیں لکھا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ صحیح ہوگا کیونکہ اس زمانہ کے ایسے نام اکثر نظر سے گذرتے ہیں۔ چنانچہ میر صاحب کے استاد کا نام سید علی نورالدین الموسوی تھا[۲]۔ ممکن ہے کہ میر صاحب نے اختصار کی خاطر اپنی کتاب میں جہاں اپنے نام کے آگے میر نہیں لکھا اپنے والد کا نام بھی مختصر کرکے لکھا ہو۔

میر صاحب کی والدہ مشہور عالم و فاضل امیر فخرالدین ساکی کی بہن تھیں[۳]۔ یہ امیر اپنے علم اور شرافت کی وجہ سے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور مشہور فاضل میر غیاث الدین منصور کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔

ولادت

میر صاحب کی تاریخ ولادت ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکی البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ دسویں صدی ہجری کے وسط میں یعنی سنہ ۹۶۰ھ سے قبل پیدا ہوئے۔ کیونکہ وہ ۹۸۶ھ سے کئی سال پیشتر ہی اتنے متبحر اور عدیم المثال عالم اور صاحب تقویٰ بزرگ مشہور ہو چکے تھے کہ شاہ طہماسپ نے ان کو شہزادہ کا اتالیق مقرر کیا اور اس خدمت کو وہ ایک مدت تک انجام دیتے رہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب وہ محرم ۹۸۹ھ میں ایران چھوڑ کر حیدرآباد پہنچے تو اس وقت ان کی عمر کسی طرح تیس ۳۰ سال سے کم نہ تھی۔

تعلیم و تربیت

میر محمد مومن کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی چنانچہ ابتدا میں خود ان کے ماموں نے ان کو علوم معقول و منقول کی تعلیم دی اور بچپن ہی سے تواضع، فروتنی کسر نفسی اور خوش خوئی کی کچھ ایسی عادت ڈال دی کہ یہ ہونہار تمام عمر اس پر عمل پیرا رہا اور ہمیشہ اپنے

۱؎ محبوب الزمن جلد ۲ صفحہ ۹۹۰ ۔ ۲؎ تذکرہ علما مولفہ محمد بن سلیمان ص ۹۹ ۔ ۳؎ تاریخ عالم آرائے عباسی ص ۱۵۹ و حدائق السلاطین ورق ۱۰۰ ا

اخلاق حسنہ کی داد حاصل کی۔ علی ابن طیفور بسطامی نے لکھا ہے:۔

"در ایام جوانی کہ بہارِ زندگانی است تحصیل کمالاتِ نفسانی از خدمت خال بزرگوار خود نمودہ در علوم معقول و منقول نقش مہارت بر صفحۂ ضمیر طلبۂ علوم می کاشت۔ بصفت تواضع و فروتنی وکسرِ نفسی وخوش خوئی انصاف داشتہ دراں باب مبالغہ می نمود۔"[1]

ماموں کی تعلیم کے علاوہ میر صاحب نے کتب حدیث و ادب میں مولٰنا سیّد علی نورالدین الموسوی شستری سے استفادہ کیا اور سند حاصل کی تھی۔[2]

حدیث کے سوا علم جفر، نجوم، فتح عزیمت اور تسخیر جنات میں انتہائی کمال حاصل کیا تھا جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں درج رہے گا۔

شاہ ایران کے دربار میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میر صاحب اپنے ماموں کے ساتھ شاہ طہماسپ صفوی کے اردوئے معلےٰ میں پہنچے۔ بادشاہ نے ان کے علم و فضل اور اخلاق و شائستگی کو دیکھ کر اپنے دربار میں بار یاب اور نوازش شاہانہ سے سرفراز کیا ساتھ ہی شاہزادہ حیدر مرزا کی تعلیم و تربیت کے لئے بطور اتالیق کام کرنے کا فرمان جاری کیا۔ تاریخوں میں لکھا ہے

"حسب الفرمان حضرت خاقان بر تعلیم شاہزادہ مغفور"[3]

"باردوئے معلائے شاہ جنت مکان شاہ طہماسپ آمدند۔ و بہ نوازش پادشاہانہ سرفراز گشتند۔

---

[1] حدائق ورق ۱۸۰ ا — [2] تذکرہ علماء ۹۹ و محبوب الزمن جلد دوم صفحہ ۹۹۵

[3] عالم آرائے عباسی صفحہ ۱۵۹ —

حسب الفرمان قضا جریان جناب میر تجستہ پر تعلیم شاہزادۂ عالمیان سلطان حیدر مرزا قیام نمودند[1]"

"در عہد شاہ طہماسپ بمنصب معلمی شہزادہ سلطان حیدر سرفرازی داشتہ[2]"

غرض میر مومن صاحب نے ابتدا ہی سے اپنی شرافت نسبی، محاسن اخلاق، اور علم و فضل کی وجہ سے انتہائی عزت و وقعت کی زندگی بسر کی شاہ طہماسپ جیسے بادشاہ کا کسی نوجوان کو اپنے شاہزادہ کی تعلیم کے علاوہ اتالیقی اور ادب آموزی کا کام بھی سپرد کرنا ظاہر کرتا ہے کہ میر صاحب کی پیشانی پر شروع ہی سے عظمت کا ستارہ چمک رہا تھا۔

ایران سے ہجرت

میر صاحب کا نیّر اقبال متقاضی تھا کہ وہ ایران میں محض ایک شاہی اتالیق کی حیثیت سے قیام پذیر نہ رہیں۔ ان کی قسمت میں تو ایک بڑی سلطنت کی پیشوائی اور ایک بہت بڑے بادشاہ کا مختار کل بننا لکھا تھا۔ اور اس کے لئے ضروری تھا کہ ایران میں ایسے اسباب پیدا ہوتے کہ ان کے دل میں وہاں سے ہجرت کر جانے کا خیال پختہ ہوجاتا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو انکا شاگرد سلطان حیدر مرزا عنفوان شباب میں انتقال کر گیا۔ پھر شاہ اسمٰعیل کے عہد میں وہ ایران میں توقف کرنے کی تاب نہ لاسکے[3]۔ اور تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ ہوی کہ ان کے ہم چشم ان کے تبحر علمی اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے ان سے حسد کرنے لگے۔

---

[1] حدائق السلاطین ورق ۱۸۰ ا۔ [2] ید بیضا صفحہ ۲۷۶۔ [3] (ا) درزمان استیلائے اسمٰعیل مرزا تاب توقف ایران نیاوردہ۔ عالم آرائے عباسی صفحہ ۱۵۹۔ (ب) "بعد از وقوع قضیۂ ناگزیر آں شاہزادۂ مغفور درزمان اسمٰعیل مرزا تاب توقف ایران نیاوردہ۔ حدائق ص ۱۸۰ ا

ہم چشموں میں ممتاز رہنے کی وجہ سے یوں تو ابتدا ہی سے وہ محسود ہو گئے تھے لیکن جب شاہزادہ کا انتقال ہو گیا تو ان کے مخالفین کی بن آئی۔ چونکہ یہ علم معقول میں عدیم المثال سمجھے جاتے تھے' اور علم جعفر اور عملیات میں بھی دلچسپی لیتے تھے' اسکے علاوہ بڑے عقیل و فہیم تھے اس لئے حاسدین نے ان کے خیالات کو دہریت اور الحاد کی طرف منسوب کیا اور ان کے اخراج کے در پے ہوئے۔

آخر کار میر صاحب خود ان مخالفتوں کے باعث ایران سے دل برداشتہ ہو گئے اور ۹۸۶ھ میں قزوین سے تہیۂ سفر کیا اور عراق و عرب کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ جہاں حج اور زیارتوں سے فارغ ہونے کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا۔

دکن میں آمد | یہ عجیب بات ہے کہ اکثر مورخ میر صاحب کی گولکنڈہ میں آمد کی تاریخ اوائل محرم الحرام ۹۸۹ھ لکھتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ یہاں آکر سلطان ابراہیم قطب شاہ کی ملازمت اختیار کی مثلاً حدائق السلاطین میں لکھا ہے:-

"در اوائل محرم الحرام سنہ نہصد و ہشتاد و نہہ داخل گولکنڈہ شدہ بجہت وفور تشیع ملازمت ابراہیم قطب شاہ اختیار نمودہ" (ورق ۱۸۷ ب)

ید بیضا میں لکھا ہے:-

"درخدمت ابراہیم قطب شاہ مرتبۂ عالی یافتہ و بعد فوت او بملازمت پسرش محمد قلی" ط ۲۷۶

محبوب الزمن میں لکھا ہے:-

اوائل محرم سنہ مذکورہ (۹۸۹) میں گولکنڈہ حیدرآباد دکن میں وارد ہوا اس وقت سلطان ابراہیم قطب شاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھا۔ میر موصوف بادشاہ کے دربار میں

باریاب ہوا۔ بادشاہ قدردان نے میر کی بڑی تعظیم و توقیر کی" (جلد دوم ص۱۹۱)

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ میر مومن صاحب کی آمد گولکنڈہ سے آٹھ ماہ قبل ہی بتاریخ ۲۱ ربیع الثانی ۹۸۸ھ کو انتقال کر چکا تھا۔ چنانچہ تاریخ قطب شاہی میں یہی تاریخ درج ہے[1]۔ اور اس کے فرزند محمد قلی نے بھی یہی تاریخ اس کے لوح مزار پر کندہ کرائی ہے یعنے "یوم الخمیس الحادی والعشرین من شہر ربیع الثانی سنہ ثمان وثمانین وتسع مائتہ الہجرۃ النبویہ"۔

معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مورّخوں سے اس معاملہ میں اس لئے غلطی ہو گئی کہ اصل میں ابوالقاسم فرشتہ جیسے قدیم اور ہم عصر مورّخ نے سلطان ابراہیم قطب شاہ کی تاریخ وفات غلط لکھدی تھی یعنے وہ لکھتا ہے:۔

"در ۹۸۹ھ تسع وثمانین وتسعمائتہ ابراہیم قطب شاہ نیز بصوب آخرت رایت عزمیت بر افراشت[2]"

تاریخ عالم آرائے عباسی میں جو خود میر صاحب کی زندگی میں لکھی گئی تھی بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"بجانب ہند و دکن رفت۔ از ولایت عظام دکن بنابر وقوع تشیع سلسلۂ علیۂ قطب شاہیہ ملازمت محمد قلی قطب شاہ اختیار نمودہ" ص۱۵۹

غرض میر مومن صاحب جب گولکنڈہ پہنچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطان ابراہیم قطب شاہ کو انتقال کئے ہوئے سات آٹھ ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا اور پندرہ سالہ نوجوان بادشاہ محمد قلی قطب شاہ

---

[1] تاریخ قطب شاہی ورق ۱۰۸۔ [2] تاریخ فرشتہ مطبوعہ ۱۲۸۱ھ جلد دوم صفحہ ۱۷۲۔

۵۶۷

تخت نشین ہوتے ہی نظام شاہیوں کی مدد اور عادل شاہیوں کے مقابلہ کے لئے پایۂ تخت سے باہر گیا ہوا تھا۔ اور قلعہ نلدرگ کے سامنے معرکۂ کارزار میں مصروف تھا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ تقریباً اسی زمانہ میں ایک اور ایرانی ادیب علی ابن عزیز اللہ طباطبا (جس نے بعد کو برہان ماثر لکھی) دکن آکر محمد قلی کی بارگاہ میں باریاب ہوا تھا۔ لیکن وہ گولکنڈہ آنے کی جگہ راست میدان جنگ میں پہنچکر بادشاہ کا ملازم ہوگیا۔[1] چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"حاوی این اوراق راہم درآں نزدیکی از ولایت عراق اتفاق ہندوستان افتادہ در سلک خدام عتبۂ علیائے قطب شاہی انتظام داشت۔ و دراں روز (جنگ) در ملازمت حضرت قطب شاہ...... استادہ ایں واقعہ ہایلہ را رائے العین مشاہدہ می نمود۔"

گولکنڈہ میں ابتدائی چند سال

جس طرح بعض مورخوں کا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ میر مومن صاحب ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آئے یہ روایت بھی غلط ہے کہ محمد قلی نے تخت نشین ہوتے ہی ان کو اپنا وکیل مطلق بنا لیا۔ کیونکہ وہ اسوقت عربستان میں تھے۔ اور اس تخت نشینی کے آٹھ ماہ بعد دکن پہنچے تھے۔ دکن کی آمد کے بعد بھی وہ فوراً ہی وکیل السلطنت نہیں بنائے گئے بلکہ کچھ عرصہ خاموش طور پر درس و تدریس میں مصروف رہے۔

چونکہ بڑے عالم و فاضل اور مدبر و دانشمند تھے اور ایرانی دربار میں موقع شناسی اور آداب مجلس سے واقف ہو چکے تھے اس لئے رفتہ رفتہ ان کی صفات کی اتنی شہرت ہوگئی کہ

---

[1] برہان ماثر صفحہ ۵۳۴۔

محمد قلی قطب شاہ بھی اُن کی عزت کرنے لگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیاداری اور انتظام سلطنت سے زیادہ زہد و تقویٰ اور درس و تلقین سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لئے عرصہ تک امور سلطنت میں دخیل ہونا پسند نہ کیا۔ وہ ایران کے تجربہ کی بنا پر جانتے تھے کہ دنیاداری کے ذریعہ سے جو عزت حاصل کی جاتی ہے وہ دیرپا نہیں ہوتی۔ خود میر شاہ میر (جو اُن کے ورود دکن کے وقت گولکنڈہ میں برسرِ اقتدار اور وکیل مطلق تھا اور سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اُن کی آمد کے کچھ روز بعد ہی اس کی لڑکی سے دھوم دھام سے شادی بھی کی تھی) میر مومن صاحب کے سامنے ہی حاسدوں کی سازش میں گرفتار ہوکر سلطنت سے باہر بھیجوا دیا گیا۔[1]

ان حالات کے تحت حضرت میر مومن درباری زندگی کو کیوں کر پسند کر سکتے تھے! اس سبب کے علاوہ یہ خیال کہ محمد قلی نے فوراً ہی عہدۂ وزارت اور وکالت مطلق پر اُن کو مامور کر دیا تھا[2] اس لئے بھی غلط ہے کہ محمد قلی کے ابتدائی زمانہ میں میر شاہ میر

---

[1] (۱) دیکھو برہان ماثر صفحہ ۵۲۶ - (۲) فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۷۲ - (۳) حیات محمد قلی قطب شاہ صفحات ۳۶۸ تا ۳۷۱ -

[2] محبوب الزمن میں لکھا ہے :-

"سلطان جدید نے میر موصوف کو عہدۂ وزارت و وکالت مطلق پر مقرر فرمایا اور کل امور سلطنت کا مختار کل بنایا۔ اور آپ لہو و لعب میں مشغول ہوا" (حصہ دوم ص۹۹۱)

اس عہدۂ جلیلہ پر فائز تھا اور اس کے بعد ملک ابن الملک الف خاں نے تقریباً پندرہ سال اپنی وفات تک جملتہ الملکی کی خدمت انجام دی۔

اس خیال کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے حضرت میر محمد مومن کو صرف وزارت مطلق پر سرفراز نہیں کیا بلکہ پیشوائے سلطنت بنایا تھا۔ اور یہ خدمت ایسی نہ تھی جس پر ایک نووارد شخص کا فوراً ہی تقرر کر دیا جا سکتا۔ اس کے متعلق دوسرے حصے میں تفصیل سے معلومات درج ہیں ۔

دوسرا حصّہ

پیشوائی محمّد قلی قطب شاہ

محمد قلی کی بارگاہ میں میر صاحب کے اقتدار کا آغاز

چار پانچ سال تک گولکنڈہ میں علمی و مذہبی زندگی گذارنے کے بعد میر مومن صاحب کو سیاست کے میدان میں قدم رکھنا ہی پڑا۔ سید تقی میر شاہ میر کے زوال کے بعد ہی سے جو اس سال بادشاہ اُن کی رائے اور مشورہ سے مستفید ہونے لگا تھا چنانچہ ۹۹۱ھ سے قبل ہی محمد قلی قطب شاہ ان کی اصابت رائے، علم و فضل، اور زہد و تقویٰ کا اتنا زیادہ معتقد ہو گیا تھا کہ وہ ان کو اپنی سرکار و دربار میں دخیل کئے بغیر نہ رہا۔ لیکن اس وقت بھی وہ میر جملہ یا دیوان نہیں بنائے گئے بلکہ پیشوائے سلطنت قرار دئے گئے تھے۔ میر جملگی کی خدمت پر تو ملک امین الملک ہی فائز رہا جس نے یہ عہدہ آخر تک (یعنے ۱۰۰۰ھ یا ۱۰۰۱ھ تک) سنبھالے رکھا۔ اور اس کے بعد بھی جب یہ خدمت خالی ہوئی تو ایک دوسرے میر جملہ کا تقرر کیا گیا جس کا ذکر آئندہ تفصیل سے کیا جائیگا۔ کیونکہ حضرت میر مومن کی زندگی میں جتنے لوگ میر جملگی یا دیگر وزارتوں پر متقرر ہوئے وہ سب انہی کی سفارش اور رائے کی بنا پر منتخب ہوئے تھے۔

اس واقعہ کا ثبوت کہ میر صاحب ۹۹۳ھ میں یا اس سے قبل پیشوائے سلطنت اور وکیل مطلق مقرر ہوئے دو طرح سے فراہم ہوتا ہے۔ ایک تو تاریخ فرشتہ کا یہ بیان کہ

"قریب بیست و پنج سال وکیل السلطنت آنحضرت" صفحہ ۱۷۳۔

یعنے ۲۵ سال سے میر مومن صاحب محمد قلی کے وکیل السلطنت ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب شروع سلطنت محمد قلی سے اس خدمت پر فائز نہیں رہے۔ کیونکہ محمد قلی نے تقریباً بتیس[۳۲] سال حکومت کی

اور جب اس کا انتقال ہوا میر مومن صاحب ہی وکیل سلطنت اور پیشوا تھے۔ جس وقت تاریخ فرشتہ لکھی جارہی تھی۔ محمد قلی کا آخری زمانہ تھا اور اس تاریخ میں عہد محمد قلی کے صرف ۱۰۱۷ھ (حیدرآباد میں غیر ملکیوں کے قتل و خون) تک کے واقعات درج ہیں۔ اور شہزادہ مرزا خدابندہ کی جو بغاوت ۱۰۱۸ھ میں واقع ہوئی تھی فرشتہ نے اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس امر کی تعریف کی ہے کہ بادشاہ اور اس کے بھائیوں کے تعلقات بڑے اچھے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"آں قطب کامگاری راچند چیز نصیب گشتہ کہ کمترے از پادشاہاں بآں فائز شدہ اند۔ یکے آں کہ برادران را بر مسند عزت متمکن ساختہ انیس و جلیس خود گردانید و با ایشان بے دغدغۂ خاطر مصاحبانہ سلوک می نماید۔ و برادراں نیز اورا فوزے عظیم دانستہ در کمال اخلاص و یک جہتی با برادر بزرگ سامی باشند۔ و اصلا درین مدت سی سال از جانب ایشاں غبار برآئینہ خاطر اشرف آں پادشاہ راہ نیافتہ بود و ایں عطیہ ایست کہ ہر کس بہ آن سرفراز نمی گردد[1]"

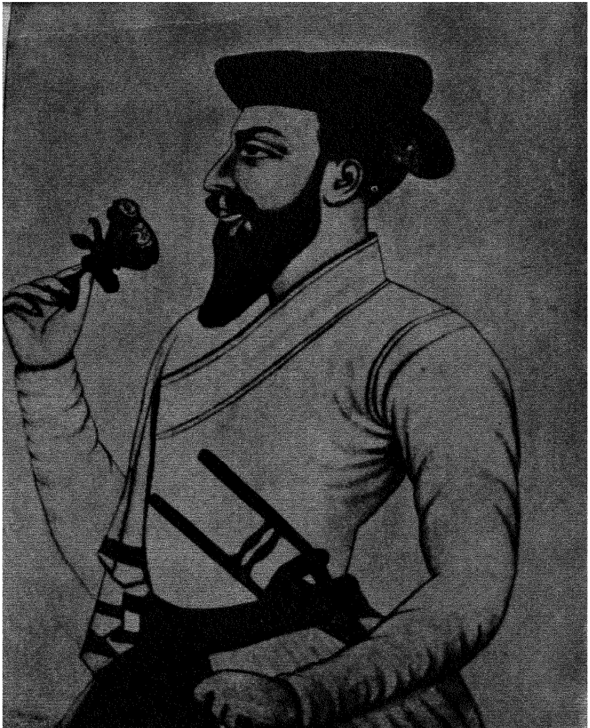
غرض اس سے ثابت ہوا کہ تاریخ فرشتہ میں محمد قلی کے حالات خدابندہ کی بغاوت سے قبل تک قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور اس وقت میر مومن صاحب کو پیشوائی کی خدمت کرتے ہوئے پچیس سال گذر چکے تھے اور بادشاہ کو ان پر پورا اعتماد تھا چنانچہ فرشتہ کے الفاظ ہیں:۔

قدر و مرتبۂ آں سید بزرگوار شناختہ مریدانہ با او سلوک می نماید۔ و نوعے نمی کند کہ دقیقہ'

[1] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۷۳



سلطان محمد قلی قطب شاہ
(میر محمد مومن کا معتقد)



مرزا محمد امین میر جملہ (میر صاحب کا دست گرفتہ)

از لوازم تعظیم و تواضع فروگذاشت شود۔ واین کہ اعتماد و وثوق تمام براصابت رائے
آن ہوشمند روشن ضمیردار در جمیع مہمات سلطنت خصوصاً کار ہائے بزرگ بوئے رجوع کردہ"[1]

ایک اور واقعہ جس سے محمد قلی قطب شاہ کی بارگاہ میں میر صاحب کے صاحب اقتدار ہونے کا زمانہ معلوم ہو سکتا ہے شہر حیدرآباد کی بنا اور تعمیر ہے۔ اس شہر کی تعمیر کا خیال ۹۹۹ھ سے قبل ہی محمد قلی کے ذہن میں سما چکا تھا۔ اور جس وقت اس فرخندہ بنیاد شہر کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی میر مومن صاحب اتنے مقتدر اور ذی اثر تھے کہ انھوں نے شہر کا نقشہ بنانے اور دیگر امور میں بادشاہ کی بڑی مدد کی۔

چنانچہ جب دولت خانۂ عالی بنا ہے اور اس کے وسیع جلوخانہ کے چاروں طرف چار کمانیں تیار ہوئیں تو محل میں داخل ہونے کی کمان کے پاس میر صاحب نے ایک پتھر کا ستون نصب کیا جس پر طلسم اور تعویذ بنائے تھے تاکہ اگر کوئی برے ارادے سے بارگاہِ شاہی میں آئے تو اس کا سحر و عزیمت باطل ہو جائے[2]

چنانچہ اسی وجہ سے یہ کمان اب تک کمان سحر باطل کہلاتی ہے۔

اس واقعہ کے علاوہ شہر کے نقشہ میں چار منار، دارالشفا اور خود دائرہ کے محل وقوع وغیرہ سے متعلق امور بھی حضرت میر مومن ہی کی رائے سے قرار پائے تھے جن کا ذکر آئندہ تفصیل سے درج رہے گا۔

خدمت پیشوائی

حضرت میر مومن کے عہدۂ پیشوائی کے حالات بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس عہدہ جلیلہ کی اہمیت اور فرائض سے متعلق کچھ لکھا جائے۔

سب سے پہلے یہ امر قابل ذکر ہے کہ پیشوائی کا عہدہ، بڑی وزارت یعنے میر جملگی یا دیوانی سے بھی

---

[1] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۷۴ ۔ [2] ماہنامہ ورق ۳۰۵ ب ۔

اعلیٰ تھا۔ اتنا اعلیٰ کہ خود میر جملہ کا تقرر بغیر پیشوا کی رائے و مشورہ کے نہیں کیا جاتا تھا[1]۔ پیشوا اصل میں نائب بادشاہ اور مشیر و رہبر سلطنت ہوا کرتا تھا۔ اور سلطنت کے جملہ امور خواہ دینی ہوں یا دنیوی اُسی کے توسط سے انجام پاتے تھے۔ گویا وہ ایک ساتھ قاضی القضاۃ، صدر الصدور، شیخ الاسلام، وکیل السلطنت، اور مدار المہام غرض بادشاہ کے بعد سب کچھ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خدمت کے لئے ایک ایسی ہستی کا انتخاب کیا جاتا تھا جو ملک میں سب سے بلند مرتبہ رکھتی تھی۔

ایک اور امر یہاں واضح ہو جانا چاہئے کہ قطب شاہی سلطنت میں ملک نائبی کا بھی ایک عہدہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن پیشوائی ملک نائبی سے بھی بہت اعلیٰ رتبہ تھا۔ اور ایک ہی وقت میں پیشوا اور ملک نائب دونوں موجود رہتے تھے۔

ملک نائب اصل میں وہ عہدہ دار ہوا کرتا تھا جو ویسرائے کے طور پر کسی علاقہ کی حکومت یا تسخیر کے لئے مامور ہوتا یا جس کو کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے بادشاہ اپنی جگہ روانہ کرتا تھا۔ اور اس طرح ایک پیشوا کے ماتحت کئی ملک نائب رہ سکتے تھے۔ لہٰذا پیشوا اور ملک نائب کو ایک ہی سمجھ لینا غلطی ہے۔

میر مومن صاحب سے قبل قطب شاہی سلطنت میں صرف ایک ہی شخص کا ایسا پتہ چلتا ہے

---

[1] مثال کے لئے محمد امین میر جملہ اور عہد محمد قطب شاہ و عبد اللہ قطب شاہ کے اکثر وزرا کے تقررات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد محمد قلی و عہد سلطان محمد امین تو میر مومن صاحب کی اور عہد عبد اللہ قطب شاہ میں علامہ ابن خاتون کی رائے اور مشورے سے تقررات کئے جاتے تھے۔

جس کو یہ عزت و فضیلت حاصل ہو سکی تھی۔ اور وہ سیف خاں عین الملک فرزند فتحی خاں عمزادہ سلطان قلی قطب شاہ ہے جس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ جمشید قلی سے کسی بات میں ناراض ہو کر گولکنڈہ سے احمد نگر چلا گیا تھا لیکن جب جمشید کا انتقال ہو گیا اور اس کا کمسن لڑکا سبحان قلی تخت نشین ہوا تو جمشید کی بوڑھی ماں بلقیس زماں نے اپنے اس عزیز کو طلب کر کے پیشوائے سلطنت بنا دیا تا در شاہزادہ کے سن رشد کو پہنچنے تک سیف خاں کاروبار سلطنت کو انجام دے۔ چنانچہ اس نے سبحان قلی کے دشمنوں کو بڑی جرأت، تدبر، اور بہادری سے شکستیں دیں۔ اور اس شان و شوکت سے پیشوائی اور حکومت کرنے لگا کہ اگر شہزادہ ابراہیم قلی جیسے ہر دلعزیز اور صاحب تدبیر دعوہ دار سلطنت سے بہت جلد مقابلہ در پیش نہ ہو جاتا تو کیا تعجب کہ سیف خاں عین الملک عرصہ تک نہ صرف پیشوائی کر سکتا بلکہ شاید سلطنت پر بھی قابض ہو جاتا[1] لیکن ابراہیم قلی قطب شاہ کی آمد آمد کی خبر سن کر وہ گولکنڈہ سے پھر احمد نگر کی طرف چلا گیا۔

عہد ابراہیم قلی میں اگرچہ سید کمال الدین المعروف بہ مصطفیٰ خاں اردستانی اور اس کے بعد سید شاہ تقی المعروف بہ میر شاہ میر جیسے بلند پایہ وزرائے مختار اور وکیل السلطنت گذرے ہیں لیکن تاریخوں میں ان دونوں کے نام اور کام کے ساتھ کہیں بھی پیشوائی کا ذکر نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم قلی نے کسی کو پیشوا نہیں بنایا۔ بلکہ وکیل مطلق اور وزیر مختار سے بڑھ کر درجہ پر اپنے عہد میں کسی کو فائز ہی نہ ہونے دیا۔ حالانکہ مصطفیٰ خاں نے تو سلطنت کے حصول میں ابراہیم کی بڑی امداد کی تھی۔ اور ابراہیم قلی نے اس کی بزرگی اور وفاداری سے خوش ہو کر اس کو اپنی بہن بھی نکاح میں دی تھی۔[2]

---

[1] عین الملک پیشوا کے حالات کیلئے دیکھو برہان مآثر صفحات ۳۲۸، ۳۴۴، ۳۸۰، ۳۸۳، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۹۲ تا ۳۹۴۔ حدیقۃ العالم صفحات ۱۱۱ و ۱۴۸

[2] مصطفیٰ خاں وزیر کے تفصیلی حالات کیلئے دیکھو تاریخ قطب شاہی حالات ابراہیم قلی قطب شاہ۔ حدیقۃ العالم ص ۱۱۵ برہان مآثر صفحات ۳۰۵، ۳۲۸، ۳۹۵، ۴۱۳، ۴۲۷ وغیرہ۔

ابراہیم قلی کے بعد عہد محمد قلی میں میر مومن صاحب کے عہدۂ پیشوائی پر فائز کئے جانے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میر شاہ میر کی دختر سے محمد قلی کی شادی ہونے کے بعد محمد قلی نے اعزاز کے طور پر اپنے خسر میر شاہ میر کو اپنا پیشوا بنا دیا ہو گا کیونکہ ایک تو رشتہ اور دوسرے محمد قلی کی کم سنی کی وجہ سے خود شاہ میر کے لئے (جس کے حوصلے ہمیشہ بلند رہے) لازمی تھا کہ اس کی ضرورت محسوس کراتا اور جب زمانہ کی گردشوں نے میر شاہ میر کو زیادہ عرصہ تک اس مرتبہ سے لطف اندوز نہ ہونے دیا اور وہ بہت جلد بے آبرو کر کے نکال دیا گیا[1] تو محمد قلی نے پہلے تو اس منصب کو خالی رکھا لیکن جب حضرت میر مومن کا بہت معتقد ہو گیا تو اس خالی شدہ خدمت کو پر کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کر کے ان کی خدمت میں پیشوائی قبول کرنے کی استدعا کی۔

چونکہ شاہ میر ملکی امراء کی سازش سے بہت جلد معتوب ہو کر سلطنت سے نکال دیا گیا اس لئے اس کی چند روزہ پیشوائی کا تذکرہ تاریخوں میں درج نہیں۔ یوں بھی جب کوئی امیر یا وزیر بادشاہوں کے معتوب ہو جاتے ہیں تو مورخین ان کا تفصیل سے ذکر کرنا تو کجا خود اپنے ابتدا میں لکھے ہوئے القاب و آداب بھی آخر تک قائم نہیں رکھتے۔[2]

---

[1] میر شاہ میر کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھو حیات محمد قلی قطب شاہ صفحات ۳۶۱ تا ۳۶۸ ۔

[2] مثال کے طور پر سیف خاں عین الملک کا تذکرہ برہان ماثر میں قابل مطالعہ ہے مثلاً سیف عین الملک کہ..... از امرائے نامدار ممالک دکن بسمت شجاعت و اقتدار منفرد و ممتاز بود ص۳۲۸ ۔ سیف عین الملک کہ درمیاں امراء ممالک دکن بکمال تہور و شجاعت اشتہار داشت ص۳۸۰ ۔ عین الملک نکوہیدہ مال..... سر دفتر ارباب عناد ص۳۹۲ ۔ خاطر شقاوت مآثر عین الملک ..... کینہ ور ص۳۹۳ ۔ پنجہ نخوت و غرور عین الملک مقہور ص۳۹۴ ۔

اس امر کا ثبوت کہ قطب شاہی سلطنت میں پیشوائی کی خدمت زیادہ تر اقربائے بادشاہ ہی کو دی گئی ہے اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ خود حضرت میر مومن کے انتقال کے بعد جب یہ عہدہ خالی ہوا تو سلطان محمد قطب شاہ نے کسی کو اس کا اہل نہ سمجھ کر خود ہی یہ خدمت بھی انجام دی۔ اور اس کے انتقال کے بعد جب کمسن شہزادہ عبداللہ مرزا تخت نشین ہوا تو پھر کسی پیشوا کی ضرورت محسوس کی گئی اس وقت بھی ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا جو بادشاہ سے قریب ترین قرابت رکھتا تھا۔ یعنے شہزادہ عبداللہ کی دادی خدیجہ مرتبت خانم آغا نے اپنے داماد سید شاہ محمد حسینی بن شاہ علی عرب شاہ کو جو عبداللہ قطب شاہ کے حقیقی پھوپا تھے اس خدمت پر مامور کیا[۱]۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت شہزادہ عبداللہ قلی کی دادی نے بالکل وہی عمل کیا جو جمشید قلی کی وفات پر شہزادہ سبحان قلی کی دادی نے کیا تھا۔ گویا خاندان کی قدیمی سنت کی پیروی کی گئی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سید شاہ محمد حسینی کے بعد جس ہستی (یعنے علامہ ابن خاتون) کو پیشوا مقرر کیا گیا وہ اگرچہ شاہی خاندان سے تعلق نہ رکھتی تھی لیکن حضرت میر محمد مومن کی صحیح معنوں میں جانشین تھی۔ علامہ شیخ محمد ابن خاتون کے لئے یہی شرف طرۂ امتیاز تھا۔ وہ حضرت میر مومن کے فیض یافتہ شاگرد، معتقد اور متوسل خاص تھے۔ یہی علامہ ابن خاتون[۲] غالباً خاتم پیشوایان قطب شاہیہ ثابت ہوئے۔ کیونکہ ان کے بعد

۱۔ شاہ محمد پیشوا کے مزید حالات کے لئے دیکھو حدیقۃ السلاطین ص ۲۸ تا ۹۱۔ مآثر دکن ص ۲۴ و ۲۶

۲۔ علامہ ابن خاتون پیشوا کے حالات سے تاریخ حدیقۃ السلاطین معمور ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس تاریخ کی ترتیب کا اہم ترین مقصد اسی پیشوائے سلطنت کے کارنمایاں کو محفوظ و مرتب کرنا نظر آتا ہے۔

قطب شاہی سلطنت میں پھر کسی کو یہ اعزاز نصیب نہ ہوا۔ حالانکہ ابوالحسن قطب شاہ نے حضرت سید شاہ راجو کی مدد سے سلطنت حاصل کی اور ان کو صحیح معنوں میں اپنا پیشوا اور ہادی و مرشد سمجھتا تھا لیکن اس بات کے ثبوت تاریخوں میں موجود نہیں ہیں کہ آیا شاہ راجو سرکاری طور پر خدمت پیشوائی پر مامور بھی کئے گئے تھے یا نہیں؟ البتہ اس زمانہ کے ادب کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سید شاہ راجو عہد ابوالحسن قطب شاہ میں بہت بااثر تھے اور لوگ ان کے توسط سے شاہی دربار تک پہنچتے اور اپنی مرادیں حاصل کرتے تھے چنانچہ اس عہد کے ایک شاعر طبعی حیدرآبادی نے بہرام و گل اندام کا قصہ ایک طویل مثنوی[1] کی شکل میں لکھا تھا جس کے آغاز میں شاہ راجو کی مدح بھی درج ہے جس میں شاعر لکھتا ہے کہ میری قسمت کا بنانا تیرے ہاتھ میں ہے اس لئے میں نے تیرے قدم پکڑ لئے ہیں تو نے ابوالحسن کو دکن کا بادشاہ بنادیا ہے اور سورج بھی تیری خدمت کے لئے ہاتھ میں کرنوں کی چنور لے کر کھڑا ہے۔

طبعی کے چند مختلف شعر ہیں ؎

ولی تو بڑا ہے گگر شاہ راجو ۔۔۔ چل آیا ہے شہ تیرے گھر شاہ راجو

خبر تیری معلوم نہیں بے خبر کوں ۔۔۔ خبردار جانے خبر شاہ راجو

تو مخدوم سید محمد کے کھن کا ۔۔۔ بہت بے بدل ہے گہر شاہ راجو

کرامت ہوا سب کوں معلوم ظاہر ۔۔۔ توں باطن ہیں کر ایک نظر شاہ راجو

دکن کا کیا بادشہ ابوالحسن کوں ۔۔۔ بڑا بخت دے کر چھتر شاہ راجو

---

[1] یہ مثنوی ایک ہزار تین سو چالیس ابیات پر مشتمل ہے اور بقول مصنف صرف چالیس دن میں تکمیل کو پہنچی ہے ۔ تفصیل کے لئے دیکھو اردو شہ پارے صفحات ۱۱۰ تا ۱۱۵

کھڑا ہو کو خدمت منیں تیری سورج　　　اڑا تا کرن کی چنور شاہ راجو
کسی کے نہیں عیب جنتا توں ہر گز　　　بڑا تجھ میں ہے یو ہنر شاہ راجو
مرا دل ہے جیوں چھاؤں سنگات تیرے　　　جدہر توں چلیا تو اودہر شاہ راجو
قدم تیرے پکڑیا ہوں امید لے کر　　　مرے بخت، تیری نظر شاہ راجو
خدا پاس اُچا ہاتھ کرنا ہے قطبی
دُعا تجھ کوں شام و سحر شاہ راجو

غرض ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ پیشوائی جیسی خدمت جلیلہ یا تو اعزہ شاہی کو مل سکتی تھی یا ایسے بزرگوں کو جن کا بادشاہ خاص معتقد ہوتا تھا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت میر مومن جس وقت پیشوا بنائے گئے تو محمد قلی قطب شاہ ان کا بے حد معتقد تھا اور فرشتہ کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ

"محمد قلی قطب شاہ بواجبی قدر و مرتبۂ آں سید بزرگوار شناختہ مریدانہ با او سلوک می نماید و نوع نمی کند کہ دقیقۂ از لوازم تعظیم و تواضع فروگذاشت شود[1]"

مشاہرہ و اعزاز پیشوائی یہ تو ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ محمد قلی قطب شاہ نے میر مومن صاحب کے لئے کیا مشاہرہ مقرر کیا تھا لیکن دوسرے واقعات کے ذریعہ سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کو ماہانہ ایک ہزار ہون یعنے ساڑھے چار ہزار روپے سے کم نہ ملتے تھے۔ اس کا ثبوت کئی طرح سے بہم پہنچتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ میر مومن صاحب کے بعد جب عہد عبداللہ قطب شاہ میں

[1] فرشتہ جلد دوم مقالہ سوم روضۂ چہارم صفحہ ۱۷۴۔

سید شاہ محمد حسینی پیشوا مقرر ہوئے تو ان کو ایک ہزار ہون یعنے (موجودہ ساڑھے چار ہزار روپے) تنخواہ ماہانہ دی جاتی تھی۔ عہد عبداللہ کے مقابلہ میں محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ تاریخ گولکنڈہ میں عہد زرین سمجھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ محمد قلی اپنے پیشوا کو زیادہ مشاہرہ دیتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ملک امین الملک کے بعد محمد قلی قطب شاہ کو کسی اچھے میر جملہ کی تلاش ہوی تو میر محمد مومن نے اس خدمت کے لئے اپنے دست گرفتہ مرزا محمد امین شہرستانی کو منتخب کیا۔ جس کو بادشاہ نے ۱۰۱۱ھ میں اپنا جملتہ الملک بنا کر دو لاکھ ہون سالانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب میر جملہ کی تنخواہ دو لاکھ ہون (یعنے زمانۂ حال کے نو لاکھ روپے) مقرر کی گئی تھی تو پیشوائے کل کی تنخواہ تو اس سے کم نہ تھی۔

عہد عبداللہ قطب شاہ میں سید شاہ محمد حسینی کو منصب پیشوائی کے لئے جو سالانہ مشاہرہ بارہ ہزار ہون (یعنے چون ہزار روپے) مقرر کیا گیا تھا اس کا اس لئے بھی کم ہونا ضروری تھا کہ یہ شاہ محمدؒ کی ذاتی جاگیرات اور قدیمی مناصب کے سوا تھا۔ کیونکہ سلطان محمد قطب شاہ کے بہنوی ہونے کی وجہ سے شاہ محمدؒ ابن شاہ علی عرب شاہ ابتداہی سے قطب شاہی دربار کے عمائدین میں شریک تھے اور شاہی خاندان کے معزز افراد میں سے سمجھے جاتے تھے[1] چنانچہ بادشاہ نے اپنی بہن کی خاطر ان کو بڑے بڑے مناصب اور جاگیرات سے سرفراز کیا تھا۔ اس لئے ان عطایا کے موجود ہوتے ہوئے ان کو پیشوائی کے

---

[1] چنانچہ قطب شاہی فرامین وغیرہ میں ان کا اور ان کے فرزند شاہ خوندکار کا ذکر ہمیشہ شاہی اعزاز کے ساتھ کیا گیا ہے ان کے لوح مزار کے کتبہ پر بھی اس شاہانہ اعزاز کا خاص کر خیال رکھا گیا ہے۔

سلسلہ میں زیادہ مشاہرہ دینے کی ضرورت نہ تھی۔

میر صاحب کا مشاہرہ زیادہ ہونے کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ ایران سے آتے وقت اپنے ساتھ کوئی دولت نہیں لائے تھے اور اس زمانہ کے دوسرے وزراء مثلاً محمود گاوان اور مصطفےٰ خاں اردستانی کی طرح ان کی کوئی تجارت بھی نہ تھی لیکن شہر حیدرآباد میں انھوں نے کافی املاک خریدی تھیں اور شہر کے علاوہ قطب شاہی سلطنت میں کئی گاؤں زر کثیر صرف کرکے خریدے تھے اور کئی تالاب اور مسجدیں بھی بنوائی تھیں۔ یہ گاؤں وغیرہ ان کی جاگیرات کے سوا تھے اور ان کا تفصیلی ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ خود "دائرہ" کی زمین بھی انھوں نے خاص طور پر خرید کرکے قبرستان کے لئے وقف کر دی تھی۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ درویشانہ زندگی بسر کرنے اور اہل اللہ ہونے کے باوجود میر محمد مومن صاحب کی آمدنی کافی تھی اور چونکہ سرکاری مشاہرہ کے علاوہ کوئی اور ذریعہ آمدنی نہ تھا اس لئے یقینی ہے کہ ان کی تنخواہ ان کے دست گرفتہ مرزا محمد امین میر جملہ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اہل اللہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنے لئے زیادہ مشاہرہ لینا قبول نہ کیا ہو۔

مشاہرہ کے بعد پیشوائی کے اعزاز کا ذکر ضروری ہے۔ چونکہ پیشوا میر جملہ سے ارفع و اعلیٰ ہوتا تھا اس لئے میر مومن صاحب کو محمد قلی نے ایک خاص اعزاز یہ عطا کیا تھا کہ وہ دولت خانۂ شاہی میں پالکی میں سوار ہوکر آیا جایا کریں۔ حالانکہ دوسرے تمام امراء و عمائدین اور اعزائے شاہی بھی دروازۂ دولت خانہ عالی (موجودہ کمان سحر باطل) کے عالی شان زربفتی پردہ کے باہر ہی سواری سے اتر جاتے تھے اور کوئی شخص سوائے بادشاہ کے اس دروازہ کے اندر پالکی میں بیٹھا ہوا داخل نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن حضرت میر مومن کی پالکی کے لئے دو بادشاہوں کے عہد میں یعنے تقریباً چالیس سال تک یہ پردہ اٹھتا رہا۔

یہ عجیب بات ہے کہ میر مومن کے بعد سلطان محمد کے عہد میں کسی شخص کو یہ اعزاز نصیب نہ ہوا اور سلطان عبداللہ کے عہد میں بھی گیارہ سال تک کوئی شخص دولت خانہ عالی میں پالکی میں سوار ہو کر داخل نہ ہوسکا۔ حالانکہ سید شاہ محمد حسینی پیشوائے سلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کے پھوپا بھی تھے لیکن ان کو بھی یہ اعزاز نہیں دیا گیا۔ میر مومن صاحب کے بارہ سال بعد ان کے صحیح جانشین اور شاگرد رشید علامہ شیخ محمد ابن خاتون پیشوا کی قسمت میں یہ اعزاز لکھا تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۶ھ میں عبداللہ قطب شاہ نے اجازت دی کہ علامہ موصوف میر مومن صاحب کی طرح پالکی میں سوار ہو کر دولت خانہ عالی میں آجا سکتے ہیں۔ حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے :۔

"ورضائے اعلیٰ شد کہ نواب علامی فہامی (ابن خاتون) برنسبت مغفرت پناہ میر محمد مومن سوار پالکی شدہ بہ دولت خانہ گیتی نشانہ آمدورفت نمایند"[1]

مذہب کی ترویج

حضرت میر مومن کے پیشوا مقرر ہونے کے بعد ہی قطب شاہی سلطنت میں دو اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے جن میں ایک شہر حیدرآباد کی بنا اور دوسرا مذہب جعفری کی عام ترویج اور شہدائے کربلا علیہم السلام کے نام سے علمہائے مبارک کی استادگی سے متعلق ہے۔ اور ان دونوں میں حضرت میر مومن کی ذاتی دلچسپی اور اثر کو خاص دخل تھا۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ محمد قلی نے اپنے عقائد میں جو پختگی پیدا کی اور خادم اہل بیت رسول کے لقب[2] سے شہرت

---

[1] دیکھو حدیقہ ذکر احوال ۱۰۴۶ھ۔

[2] محمد قلی کی معاصر تاریخوں میں اس کی اسی خصوصیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ خاصکر برہان ماثر میں جہاں کہیں اس کا نام لکھا گیا ہے اس میں اس کی یہی خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے مثلاً ۱۔ "اعلیٰ حضرت اعظم ہمایون" بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳ پر

حاصل کی تھی اس کا سہرا حضرت میر مومن ہی کے سر ہے۔

حیات محمد قلی قطب شاہ میں تفصیل سے ثابت کیا گیا ہے کہ محمد قلی خود کوئی عالم و فاضل نہ تھا اور نہ اس وقت اس کی عمر ہی کوئی ایسی زیادہ تھی کہ وہ علوم دینیہ میں اتنی اعلیٰ بصیرت حاصل کر سکتا۔ حیدرآباد میں مذہب جعفری کی عام طور پر ترویج اور عاشورخانوں اور علموں کے مقام، اور دیگر مذہبی مراسم (مثلاً عید بعثت نبی، عید مولود علی، عید غدیر، اور عید سوری وغیرہ) کا آغاز محمد قلی ہی نے ۱۰۰۰ھ کے لگ بھگ کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام امور حضرت میر محمد مومن کے عہدۂ پیشوائی کے اولین ثمرات ہیں۔

جدید ترین تحقیقات کی رُو سے سلطنت قطب شاہیہ کا پہلا علم وہی ہے جو محمد قلی نے ۱۰۰۱ھ میں بنایا اور گولکنڈہ کے شاہی عاشورخانہ میں استاد کیا یہ اب تک محفوظ ہے اور گولکنڈہ کے حسینی علم کے نام سے معروف۔ اور ہر محرم میں اپنی اس قدیم اصلی عمارت میں استاد کیا جاتا ہے جس کی کرسی اس وقت سڑک سے تقریباً ایک گز نیچے ہوگئی ہے۔ اس علم مبارک پر حسب ذیل عبارت بطور مشبک درج ہے:۔

"وبشر والمومنین نصر من اللہ و فتح قریب۔ غلام علی محمد قلی قطب شاہ سنہ احدیٰ والف۔"

اس درمیانی طغریٰ کے اطراف پندرہ مشبک تختیوں میں پنجتن اور دوازدہ ائمہ معصومین کے اسما منقوش ہیں۔[۱]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ سلیمان ظل سبحانی المؤید بتائید اللہ خادم اہل بیت رسول اللہ۔" ص۹۸

۲۔ "عالی حضرت سلطنت و حشمت پناہ نصفت و معدلت دستگاہ خادم اہل بیت رسول اللہ محمد قلی قطب شاہ۔" ص۱۲۵ وغیرہ

[۱] اس علم مبارک اور محمد قلی قطب شاہ کے مذہب سے متعلق حیات محمد قلی قطب شاہ کے صفحات ۸۹ تا ۱۰۴ پر تفصیلی معلومات درج ہیں۔

اس اہم ثبوت کے علاوہ خود محمد قلی قطب شاہ کے دیوان سے بادشاہ کے مذہبی شغف اور حضرات ائمہ اثنا عشر کے ساتھ غیر معمولی ارادت کے بیسیوں ثبوت نظر سے گذرتے ہیں اور ساتھ ہی بعض ایسے اہم مذہبی مسائل کی طرف اشارے اور انکی نسبت معلومات بھی ملتی ہیں جو محمد قلی جیسے رنگیلے اور آزادہ رو بادشاہ کی افتادِ طبیعت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد قلی کو کتابی علم سے زیادہ حضرت میر مومن کے باطنی فیضان نے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ محمد قلی کی ابتدائی تعلیم اس کے بھائیوں کے مقابلہ میں ناقص تھی[1]۔ اور اس نے خود اپنے کلیات میں کئی دفعہ اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مجھ کو علم و فضل سے کوئی واسطہ نہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے

'میرے استاد مجھے علم و ہنر کی تعلیم دینا چاہتے ہیں حالانکہ میں تو ازل سے عشق کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ اگر میں علم و ہنر سیکھنا بھی چاہوں تو علما مجھے کیا سکھائیں گے؟ لوگ مجھے اُمّی سمجھتے ہیں۔ میں اس حد تک خود کو امی کہہ سکتا ہوں کہ تیرے اوصاف منہ زبانی یاد نہیں رہے اور میرا قلم ان کی وضاحت میں عاجز آگیا۔

علما و فقہا خود حقیقی علم سے ناواقف ہیں۔ وہ خود ا کے معنے نہیں جانتے اور مجھ سے کہتے ہیں کہ ب پڑھو۔ علم عاشقی میں ا ہی کے معنی سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اور پھر ظاہری علم و فضل سے

---

[1] وجہی کے بیان سے ظاہر ہے کہ محمد قلی زیادہ عرصہ تک مکتب میں نہیں بیٹھا۔ حیات محمد قلی ص ۲۰ ۔ محمد قلی کے علم و فضل کی تعریف کسی مورخ نے نہیں کی حالانکہ اس کے بھائیوں کے تذکرہ میں ان کے علم و فضل کی طرف ضرور اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو حیات محمد قلی صفحہ ۳۴ تا ۴۱۔

سوائے غرور و نمکنت کے حاصل ہی کیا ہوتا ہے۔ عالم لوگ اپنی بغلوں میں کتابیں رکھکر
ان کے بوتہ پر غرور کرتے ہیں" وغیرہ[1]

علم وفضل سے دلچسپی نہ ہونے کے علاوہ محمد قلی کی پوری زندگی عشق عاشقی اور رنگ رلیوں میں بسر ہوی اور خاصکر ابتدائی زمانہ تو بھاگ متی کے ساتھ اس کے شہرہ آفاق معاشقہ کی وجہ سے تاریخ دکن میں زندہ جاوید بن گیا ہے۔[2]

ان حالات کے تحت محمد قلی کا مذہب کی طرف اس اہتمام سے متوجہ ہونا ایک معجزہ سے کم نہیں نظر آتا۔ اور یہ اصل میں میر مومن صاحب کی کرامت تھی کہ ایک ایسے رندشاہد باز کے دل میں مذہب کی اتنی لو لگا دی کہ اس نے اپنے عملی کارناموں کی وجہ سے سلاطین قطب شاہیہ میں ایک اجتہادی شان پیدا کرلی۔

اگرچہ ۱۰۰۱ھ کے بعد سے محمد قلی کے مذہبی شغف کے ثبوت دستیاب ہوتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ میر مومن صاحب نے اس عظیم الشان کام کے لئے پہلے ہی سے میدان تیار کرلیا تھا اور ۹۹۹ھ ہی سے انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کا آغاز کردیا تھا یہ اور بات ہے کہ اس کی تکمیل میں چار پانچ سال لگ گئے۔ تاہم محمد قلی جیسے آزادہ رو اور مطلق العنان بادشاہ کو عین عنفوان شباب میں اس راستہ پر لگانا انہی کا کام تھا مذہبی تبلیغ اور اصلاح کے سلسلہ میں محمد قلی کو جن مخالفتوں اور بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا ان کا تفصیلی حال حیات محمد قلی میں درج ہے اس لئے یہاں ان کا بیان کرنا

[1] تفصیل اور اصل اشعار کیلئے دیکھو حیات محمد قلی صفحہ ۳۶ و ۳۷۔ [2] اس معاشقہ کا تذکرہ خود محمد قلی کے معاصرین میں فرشتہ کے علاوہ علامہ فیضی نے اپنے مکتوب (بنام شہنشاہ اکبر) میں بھی کیا ہے۔ دیکھو لطیفہ فیاضی عرضداشت دوم۔

غیر ضروری ہے۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان بغاوتوں کے بروقت فرو کرنے اور محمد قلی کی ہمہ جہتی کامیابیوں میں حضرت میر مومن کی صائب رائے اور شاید باطنی یا عملیاتی قوت کا بھی ضرور دخل تھا۔

عہد محمد قلی میں محرم اور ربیع الاول کی تقریبیں جس دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں اور جس عالی شان پیمانہ پر جشن چراغاں کیا جاتا اور تصویروں وغیرہ کی نمایش ہوتی[1] اس میں خود محمد قلی کے طبعی رجحان مجلس آرائی کے علاوہ میر مومن صاحب کی اس مصلحت کو بھی دخل تھا کہ اس طرح خود بادشاہ بھی متوجہ اور اس کے علاوہ سلطنت کے غیر مسلم عوام کو اسلام اور اس کے مسائل سے دلچسپی پیدا ہو اور وہ رفتہ رفتہ اس مذہب سے واقف اور قریب تر ہو جائیں۔ ان پرتکلف تقریبوں نے یہاں کے باشندوں کے خیال سے یہ بات نکال دی کہ اسلام محض ایک خشک اور بے لطف مذہب ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ جملہ غیر مسلم رعایا خود بھی ان تقریبوں میں خلوص اور اعتقاد سے حصّہ لینے لگی اور حاکم و محکوم کے درمیان ثقافت اور معاشرت کا زیادہ فرق باقی نہ رہا۔

شہر حیدرآباد کی تعمیر

حضرت میر مومن کی پیشوائی سلطنت کا دوسرا اہم واقعہ جو پہلے کے ساتھ ساتھ یعنے تقریباً ایک ہی زمانہ میں وقوع پذیر ہوا شہر حیدرآباد کی بنا تھا۔ اس شہر کی آبادی اور تزئین و آرائش سے متعلق حیات محمد قلی قطب شاہ میں تفصیلی معلومات درج ہیں[2]۔ اور اس موضوع پر اب ایک جداگانہ کتاب بھی زیر ترتیب ہے۔

---

[1] ان تمام امور کے تفصیلی مرقعے حیات محمد قلی قطب شاہ صفحات ۱۴۳ تا ۱۷۳ میں ملاحظہ ہوں۔

[2] دیکھو صفحات ۱۰۵ تا ۱۳۸۔

اس لئے یہاں اس بارے میں تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اس امر کا اظہار مناسب ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے ایک متمدن اور بارونق شہر بسانے کا جو نقشہ ڈالا تھا اس کے بنانے میں پیشوائے سلطنت کی رائے بھی ضرور شامل تھی۔

چارمنار کی وجہ تعمیر میں تعزیہ کو دخل ہو یا نہ ہو، اس کا روضۂ حضرت امام رضا علیہ السلام کی طرح شہر کے وسط میں بنایا جانا اور اس کے چاروں طرف بڑی بڑی سڑکوں اور بازاروں کی تعمیر میں حضرت میر مومن ہی کے مشورہ کو دخل ہوگا[1]۔ کیونکہ میر صاحب جیسے متقی پیشوائے سلطنت کی

---

[1] یہ مربع عمارت شہر کے تقریباً وسط میں پتھر اور گچ سے بنائی گئی۔ اس کے چاروں رخ بھی تقریباً چاروں اسمات (شمال، جنوب، مشرق اور مغرب) کے موافق قائم کئے گئے ہیں۔ ہر سمت ۱۰۰ فٹ عریض ہے اور اسکے منار تقریباً ۱۹۰ فٹ بلند۔ وسطی عمارت تیس فٹ عریض اور چوبیس فٹ بلند چار محرابوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان گنبد نما چھت ہے۔ اس چھت پر دو منزلہ عمارت بنائی گئی جس کی پہلی منزل پر مدرسہ اور خانقاہ اور دوسری پر مسجد اور حوض تعمیر کیا گیا۔ ان پر پہنچنے کے لئے چاروں مناروں میں زینے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ مسجد و مدرسہ و خانقاہ باہر سے نظر نہیں آتے کیونکہ ان کے اطراف خوش وضع کمانیں باہر کے رخ پر کچھ اس طرح بنائی گئی ہیں کہ اندر کی حالت ظاہر نہیں ہونے پاتی اور عمارت کے بیرونی پہلوؤں کا حسن اور تناسب بھی باقی رہتا ہے۔ بالائی منزل میں جو حوض ہے اس میں جل پلی کے تالاب سے پانی پہنچایا گیا تھا۔ یہ حوض ۱۱۵۸ھ تک موجود تھا چنانچہ تاریخ ظفرہ میں لکھا ہے:۔

"حوضے است در غایت لطافت وصفا۔ آب نہر تالاب جل پلی درآں می رسد" صفحہ ۱۱۔

چارمینار کی تعمیر میں ایک روایت کی رو سے تین لاکھ اور دوسری کے مطابق دو لاکھ باون ہزار ہون یعنے دس بارہ لاکھ روپے

باقی برصفحہ آئندہ

موجودگی میں شہر کی بنیاد کے وقت کسی مذہبی تقدس یا مناسبت کا خیال پیدا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ چارمنار کے تعزیہ نما ہونے (اور حضرت امام رضا کے مرقد منور کی طرح شہر کے وسط میں اس طرح بنائے جانے کہ اس کی چاروں طرف سے سڑکیں آکر ملتی ہوں) کے علاوہ اس کے بلندترین حصہ میں ایک نہایت خوش نما وسیع مسجد کی تعمیر اس خیال کو ظاہر کرتی ہے کہ شہر میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بلندی پر خانۂ خدا کا تعمیر کیا جانا ضروری ہے اور ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ تخیل میر مومن جیسے پیشوائے کل ہی کے ذہن میں پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اسی مسجد کی وجہ سے یہ عمارت زوال گولکنڈہ کے بعد منہدم کردئیے جانے سے بچ گئی۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف چارمنار بلکہ محلات شاہی اور دیگر خاص خاص عمارتوں کے محل وقوع کے تعین اور جگہ کے منحوس و مسعود ہونے کے بارے میں بھی میر صاحب کی روحانی اور عملیاتی قوتوں سے ضرور مدد لی گئی تھی۔ اس کا ایک ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جب دیوان خانہ عالی تیار ہونے لگا اور اس کی جانب شرق ایک ایک ہزار گز لانبا اور اتنا ہی چوڑا جلوخانہ بن گیا تو اس عظیم الشان جلوخانہ کے چاروں پہلوؤں کے وسط میں ایک ایک کمان بنائی گئی جس کی بلندی تیس گز رکھی گئی تاکہ بڑے سے بڑا ہاتھی اونچی سے اونچی عماری اور بلند سے بلند فوجی نشان کے ساتھ ان کمانوں میں سے گذر سکے۔ ان میں سے جو کمان دولت خانۂ عالی کی طرف تھی اس میں ۶۰ فیٹ بلند اور ۶ فیٹ چوڑے لشیب کی طرح سیاہ و مصفیٰ دو[2] سنگ خارا کھڑے کر کے اور ان کے اوپر ایک اور پتھر رکھکر باب عالی کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - صرف ہوئے - یا حافظ سے اس کی تاریخ نکلتی ہے (تفصیل کے لئے دیکھو مآثر دکن صفحہ ۹ تا ۱۰ اور حیات محمد قلی قطب شاہ صفحہ ۷۰ تا ۱۰۹ گلزار آصفیہ صفحہ ۲۱ - [1] شفیق نے احوال حیدرآباد میں اورنگزیب کے حکم سے داد محل کے ساتھ چارمنار کے انہدام کے آغاز اور پھر مسجد کی وجہ سے محفوظ رہجانے کا تفصیل سے تذکرہ لکھا ہے۔

چوکھٹ بنائی گئی جس میں صندل، ہاتھی دانت اور سونے کا ایک دروازہ لگایا گیا۔ جس کسی شخص کو محل و دیوان خانۂ شاہی میں جانا ہوتا تو اس دروازہ میں سے ہوکر گذرنا ضروری تھا۔ اس لحاظ سے تمام شہر میں اس دروازہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حضرت میر محمد مومن نے اسی اہمیت کے پیش نظر اس دروازہ کے سامنے ایک پتھر کا ستون گاڑ دیا تھا جس پر ایسے طلسم وغیرہ منقوش کردئے تھے جنکی وجہ سے ہر اُس شخص کا اثر زایل ہوجاتا تھا جو خراب ارادوں کے ساتھ بادشاہ کے یہاں جانا چاہتا۔ اسی وجہ سے اس کمان کا نام "کمان سحر باطل" مشہور ہوگیا اور اب تک یہ اسی نام سے مشہور ہے حالانکہ نہ اب وہ طلسمی پتھر باقی ہے اور نہ صندل اور سونے کا دروازہ۔ یہ طلسمی ستون جادو وغیرہ کے اثرات توڑنے کے علاوہ ایسا متبرک ثابت ہوا کہ شہر کے جو بیمار ایک دفعہ اس کو چھو جاتے وہ صحتمند ہوجاتے تھے۔ چنانچہ اسکی وجہ سے رفتہ رفتہ طبیبوں کا بازار سرد ہونے لگا۔ اور سب حکیم ملکر غالباً میر صاحب کی وفات کے بعد آدھی رات کے وقت اس کو وہاں سے نکالکر شہر کے باہر لے گئے اور موضع الوال کی ایک باؤلی میں ڈالدیا۔ ایک عرصہ کے بعد لوگوں کو اس کا بھی پتہ چل گیا کیونکہ جو شخص اس باؤلی میں غسل کرتا صحتمند ہوجاتا۔ اس طرح اس باؤلی پر مریضوں کا تانتا بندھ گیا تو طبیبوں نے وہاں سے بھی نکال کر کسی مخفی جگہ پوشیدہ کردیا۔ یہ واقعہ ماہنامہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے[1] اور کوئی تعجب نہیں کہ صحیح ہو کیونکہ میر صاحب کی روحانی قوت اور عالمانہ تسخیر کے اور متعدد واقعات مختلف تاریخوں میں درج ہیں جن کا ذکر اس کتاب کی ایک علحدہ فصل "تصرفات"

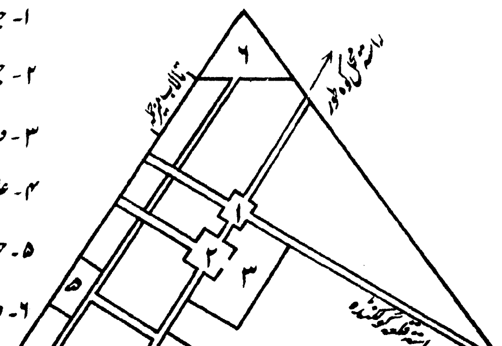
---

[1] تفصیل کیلئے دیکھو ماہنامہ نسخہ سالار جنگ بہادر ورق ۳۰۵ ب و ۳۰۶ ا۔

میں شرح وبسط کے ساتھ پیش ہے۔

میر صاحبؒ کی حویلی اور دائرے کی تعمیر

شہر حیدرآباد کی تعمیر کے سلسلہ میں میر صاحبؒ کے دولت خانہ اور دائرہ کی تعمیر کی طرف اشارہ کردینا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ دونوں میر صاحب کے عہد پیشوائی کی ابتدائی یادگاریں ہیں۔ شہر کے بازاروں، محلوں، مسجدوں، عاشور خانوں اور حماموں کے لئے مناسب مقامات کا انتخاب اور ان کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اہلِ شہر کے لئے آبادی کے ایک طرف ایک پاک وصاف قبرستان کی جگہ منتخب اور خرید کر کے میر صاحب نے محفوظ کرلی اور اس جگہ کو اپنے صرفہ سے ایک خوشنما باغ کی طور پر سجایا۔ دائرہ کے لئے یہ مقام کن وجوہ سے اور کب منتخب کیا گیا تھا ان کی تفصیل ایک علٰحدہ باب میں درج ہے جو دائرہ ہی پر لکھا گیا ہے۔ البتہ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ میر صاحبؒ نے اس کے لئے ایک نہایت متبرک اور موزوں مقام کا انتخاب کیا تھا اور یہ مقام شہر حیدرآباد کے اس کونے پر مشتمل تھا جہاں یہ شہر جانب جنوب ایک زاویہ کی شکل میں ختم ہوتا تھا۔ ذیل کے نقشے سے دائرہ کا محل وقوع صاف طور پر سمجھ میں آسکتا ہے۔



۱- چار منار
۲- جلوخانہ
۳- دولت خانہ عالی
۴- عاشور خانہ
۵- حویلی میر محمد مومن
۶- دائرہ میر محمد مومن

یہ اَمر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ حیدرآباد کا خاکہ ایک تکون کی شکل میں ڈالا گیا تھا جس کے تینوں پہلو تقریباً مساوی تھے۔ یہ مثلث موسیٰ ندی کے ساحلی خط سے شروع ہوتا تھا جو اس کا شمالی پہلو تھا۔ اس پہلو کے مقابل جو زاویہ بنتا ہے میر مومن صاحب نے اسی کو اپنے دائرہ کے لئے منتخب کیا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے شہر کا آخری گوشہ تھا جو قبرستان کے لئے بہترین مقام سمجھا جا سکتا ہے۔

میر صاحب کی حویلی

میر صاحب نے حیدرآباد کی تعمیر کے وقت اپنے قیام کے لئے شہر کا کونسا حصہ منتخب کیا تھا اس کے متعلق بھی حسن اتفاق سے صحیح معلومات حاصل ہوگئیں۔ یوں تو سوا تین سو سال گذر جانے کے بعد بھی انکے محلہ (محلہ میر مومن) اور چوک (میر چوک) کا نام ابتک باقی ہے لیکن یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ان کے دولت خانہ کا محل وقوع اور اسکی عمارت کے کچھ آثار بھی ابتک محفوظ ہیں۔ میر صاحب کا دولت خانہ وہی تھا جو اب پرانی حویلی مبارک کہلاتا ہے اور جس میں حضرت افضل الدولہ آصفجاہ خامس اور غفراں مکاں میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس رہا کرتے تھے اور اب بھی اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع کی والدۂ محترمہ قیام پذیر ہیں۔ یہ اصل میں میر صاحب کا سرکاری مکان تھا۔ اور یہاں سے ان کے دائرہ تک ایک سیدھی سڑک بنائی گئی تھی جو میر جملہ کے تالاب کے کٹے پر سے گذرتی تھی۔ میر صاحب کے دولت خانہ سے جو سڑک مغرب کی طرف جاتی ہے وہ ٹھیک بادشاہی عاشورخانہ تک پہنچتی تھی۔ میر صاحب کے دولت خانہ سے متعلق تاریخ گلزار آصفی میں لکھا ہے:۔

"مکان آنحضرت کہ فی الحال دولت خانہ قدیم بر ہمون زمین جلوۂ احداث یافتہ۔ و میر چوک موسومہ میر صاحب موصوف است۔ و تا حال دروازۂ دیوڑھی دیوان خانۂ مرشد زادۂ آفاق اکبر جاہ بہادر از محدثات آنجناب باقی ست"[۶۱۳]

میر صاحب کی بنائی ہوئی یہ کمان حال تک موجود تھی اور اب اسکی جگہ وہ گلی واقع ہے جہاں سے دفتر دیوانی بلدہ کی سڑک شروع ہوتی ہے۔

میر صاحب کے مکانات سے متعلق دوسری معلومات یہ ہیں کہ انھوں نے شہر حیدر آباد کے مشہور دارالشفا (دواخانے) کے جانب جنوب کئی مکان بنائے تھے اور ان مکانات کے مختلف حصے ان کے بعد ان کی اولاد میں تقسیم کر دئے گئے تھے جس کی بنا پر دارالشفا کی عمارت کے عقب کا علاقہ محلہ میر مومن کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ محلہ چھوٹی چھوٹی اور تنگ گلیوں پر مشتمل تھا اور اب آرائش کی وجہ سے اس کے اکثر حصے منہدم کر دئے گئے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر دو سو گیارہ سال قبل کا ایک محضر موجود ہے جس میں ایک مکان کے دیوان خانہ اور محل سرا کی زمین کا رقبہ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دیوان خانہ دارالشفائے شاہی کے عقب میں ۱۳۵ فیٹ طویل اور ۱۲۶ فیٹ عریض زمین پر بنایا گیا تھا اور اس کی محل سرا ۱۶۲ فیٹ طویل اور ۱۰۰ فیٹ عریض قطعہ زمین پر مشتمل تھی۔ ان دونوں حصوں میں بڑی بڑی باؤلیاں بھی تعمیر کی گئی تھیں[1] اور ان کے علاوہ ایک اور حصہ زمین ۶۳ فیٹ طول اور ۳۲ فیٹ عریض بھی تھا جو غالباً ڈیوڑھی کے صحن اور راستہ کا کام دیتا تھا۔ اس ڈیوڑھی کے حدود بعد کے زمانہ میں (یعنے میر صاحب کی وفات سے ایک سو چودہ سال بعد) حسب ذیل تھے ۔

۱۔ شرقی ۔ متصل خانۂ فرہاد خاں	۲۔ غربی ۔ متصل زمین مقبرہ ملا خیر الدین
۳۔ شمالی ۔ کوچۂ نافذہ	۴۔ جنوبی متصل زمین سبجی محل

یہ محضر ۲۹ ربیع الاول ۱۱۶۸ھ کو میر صاحب ہی کی اولاد میں سے ایک صاحب میر حسین بن میر عبداللہ بن میر قربان علی بن میر شاہ علی نے لکھا تھا۔ اور اس پر حسب ذیل اصحاب کی

---

[1] ایک باؤلی راقم الحروف نے بھی دیکھی ہے اور اسکو گذشتہ ہفتہ میں مکانات گرتے وقت ان کے ملبے سے بند کر دیا گیا ہے ۔

مہریں قابل ذکر ہیں[۱]۔

(۱) مفتی شرع قطب عالم محمد قادری ۱۱۳۲ھ (۲) مفتی شرع محمد معزالدین (۳) حافظ خاں دعاگوئے آصف جاہ سلمہ اللہ تعالیٰ والبقاہ۔

واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے جو مکان دارالشفا کے قریب تھے وہ ان کے خانگی مکان تھے جو ان کے بعد بھی ان کی اولاد کے قبضہ و تصرف میں باقی رہے اور پُرانی حویلی کی جگہ پر انھوں نے جو عالی شان دولت خانہ بنوایا تھا وہ پیشوائے سلطنت کا سرکاری مکان ہوگا اور میر صاحب کی

---

[۱] اس محضر کی اصل عبارت کا اقتباس درج ذیل ہے:—

"......... میر حسین بن میر عبداللہ بن میر قربان علی بن میر شاہ علی از سکنۂ بلدہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد بریں کہ یک قطعہ زمین سکنی مشتمل بر سہ دفعہ، دفعہ اول زمین دیوان خانہ طولاً چہل و پنج گز عرضاً چہل و دو گز بایک چاہ آب۔ دفعہ دوم زمین محل سرا طولاً پنجاہ و چہار گز عرضاً سی و شش گز معہ ایک چاہ کلاں۔ دفعہ سیوم زمین راہ مقبرہ میر شاہ علی مذکور طولاً بیست و یک گز عرضاً یازدہ گز کہ واقع است در محلہ میر محمد مومن قریب بدارالشفاء من محلات بلدۂ مذکور محدود الذیل حق و ملک موروثی ایں سائل است خالیاً عن حق الغیر۔ و اسناد آں در ہنگام تسخیر ملک در قلعۂ محمد نگر گم شدہ۔ والی الآن بسبب حصر وراثت میر شاہ علی مذکور زمین موصوفہ در قبض و تصرف خود داریم ...."

یہ محضر اس وقت مولوی میر عباس علی صاحب نبیرہ و سجادہ نشین درگاہ حضرت میر محمد مومن کے یہاں موجود ہے۔

وفات کے بعد قدیم دستور کے مطابق کارپردازان شاہی کے قبضہ میں چلا گیا۔

سلطان محمد قطب شاہ کی پیدائش اور تعلیم کی نگرانی

حضرت میر محمد مومن کی پیشوائی کے ابتدائی دس سالوں کا تیسرا اہم واقعہ محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین شہزادہ مرزا محمد سلطان کی پیدائش ہے۔ کیونکہ اس شہزادہ کی پوری زندگی میر مومن صاحب قبلہ ہی کے زیر اثر گذری۔ اس کی تعلیم و تربیت، اخلاق و شائستگی، زہد و تقویٰ، شادی اور تخت نشینی غرض کہ جملہ امور میں میر صاحب نے ذاتی حصہ لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ان کو ایران سے محض اس لئے ہندوستان بلوایا تھا کہ ان کی تعلیم و تلقین ایک قطب شاہی شاہزادہ کو شرافت و لیاقت کا مجسمہ بنادے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر صاحب کی گہری دلچسپی اور نگرانی کی وجہ سے سرزمین دکن کو ایک صاحب علم و فضل اور متقی و پرہیزگار بادشاہ نصیب ہوا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ اور میر محمد مومن صاحب کی زندگی میں چولی دامن کا سا تعلق معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ضعیف استاد اور محسن کی زندگی کے چند ہی ماہ بعد خود بھی عین عالم جوانی میں انتقال کر گیا۔ اس طرح اس کی ساری زندگی صحیح معنوں میں میر محمد مومن پیشوا ہی کے سایۂ عاطفت میں گذری۔

شہزادہ مرزا محمد سلطان بتاریخ ۲۳ رجب سنہ ۱۰۰۱ھ چہارشنبہ کے دن بوقت صبح پیدا ہوا تھا۔ اور اس وقت تک اُس کے چچا سلطان محمد قلی قطب شاہ کو کوئی اولاد نہ ہوئی تھی اس لئے بادشاہ اس شہزادہ کی ولادت سے بہت خوش ہوا۔ میر مومن صاحب پیشوائے سلطنت کو بھی اس ولادت سے بے حد مسرت ہوئی کیونکہ شاید انھوں نے علم نجوم و رمل و تسخیر کے ذریعہ سے معلوم کر لیا تھا کہ اس نومولود کو ان سے کتنا گہرا تعلق رہے گا۔ چنانچہ اسی روز انھوں نے یہ قطعۂ تاریخ لکھکر بادشاہ کی خدمت میں

پیش کر دیا۔

باز عالم ابتدائے کامرانی کردہ است | صد بشیر کامرانی می برد ہر سو خبر
دودمان ترکماں راخوش چراغے برفروخت | پرتو شہزادہ بر چرخ می تابد دگر
رونق عز و شرف سلطاں محمد زانکہ ہست | ہر دو عالم یک صدف از بہر آں عالی گہر
خواستم تاریخ آں فرخندہ گوہر عقل گفت | اول کام است و فیروزی و اقبال و ظفر
چوں دعا بہر زیں نمی دانم ازاں می گویمش | سرور عالم شوی در ظل اقبال پدر

گویا ولادت کے روز ہی میر صاحب نے سلطان محمد کی بادشاہت کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی۔ اور یہ ایک بہت بڑی جرأت کی بات تھی کیونکہ بادشاہِ وقت کی عمر اس وقت صرف اٹھائیس سال کی تھی اور خود اس کے یہاں اولاد پیدا ہونے کی توقع موجود تھی لیکن اس کے باوجود بادشاہ کے بھتیجے کے لئے یہ دعا دینا کہ تو اپنے باپ کے سایہ میں سرور عالم بنے ظاہر کرتا ہے کہ میر صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ محمد قلی کو اولاد نرینہ نہیں ہو گی اور انھوں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ محمد قلی کا بھائی شہزادہ مرزا محمد امین بادشاہ نہیں بنے گا بلکہ اس کا فرزند سلطان محمد بادشاہ بنے گا جبھی تو انھوں نے کہا کہ ع

سرور عالم شوی در ظل اقبال پدر

اور اس دعا میں یہ کمال بھی کیا ہے کہ در ظل پدر نہیں لکھا بلکہ در ظل اقبال پدر لکھا ہے۔ یعنے جب بادشاہ ہو گا تو چچا کی طرح باپ بھی زندہ نہ ہو گا بلکہ باپ کے اقبال کی وجہ سے شہزادہ بادشاہ بنے گا۔ گویا باپ بھی چونکہ شہزادہ تھا اور سلطنت کا وارث بن سکتا تھا اس لئے اس استحقاق کی بنا پر بیٹا بادشاہ ہو گا۔

سلطان محمد کی پیدائش کے بعد سے خود سلطان محمد قلی بھی اس کا اتنا دلدادہ ہوگیا تھا کہ اس کو اپنی فرزندی میں لینے کے لئے اپنے چھوٹے بھائی مرزا محمد امین سے خواہش کی لیکن جب تک مرزا محمد امین زندہ رہا شہزادہ کو اپنی آنکھوں سے لگائے رکھا اور اس کے ۱۵ شعبان سنہ ۱۰۰۱ھ میں بروز یکشنبہ صرف پچیس[۲۵] سال کی عمر میں وفات پا جانے کے بعد بادشاہ خود اپنے مرحوم بھائی کے مکان کو گیا اور شہزادے کو اپنے دولت خانۂ عالی میں لے آیا۔ اس وقت شہزادہ مرزا محمد سلطان کی عمر صرف تین سال ایک ماہ کی تھی۔ گویا اس نے چوتھے سال میں قدم ہی رکھا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے شہزادہ کو راست اپنے پیشوا و رہبر حضرت میر محمد مومن کی نگرانی میں دیدیا جن کے مشورہ سے قاضی محمد سمنانی قرآن شریف کی تعلیم کیلئے اور بعد کو حضرت یوسف صاحب[۱] شمشیر بازی اور تیر اندازی و دیگر علوم و فنون شاہانہ سکھانے کیلئے مقرر کئے گئے۔

غرض میر مومن صاحب نے اس نیک بخت شہزادے کی تربیت و نشو و نما میں شروع ہی سے

۱؎ حضرت یوسف صاحب نے سلطان محمد ہی کے عہد حکومت میں وفات پائی اور ان کی درگاہ محلہ نام پلی میں اب تک مرجع خلائق ہے۔ لیکن حال میں اس پر محکمہ امور مذہبی کی طرف سے جو کتبہ لگایا گیا ہے اس میں تاریخ گلزار آصفی کے بیان کے مطابق تاریخی واقعات درج کئے گئے ہیں اور حضرت یوسف صاحب کو عہد اورنگ زیب کا بزرگ بتایا گیا ہے حالانکہ اس وقت ان کو انتقال کئے ہوئے سو برس سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا۔ حضرت یوسف صاحب کے متعلق دیکھو تاریخ قطب شاہی صفحہ ۲۶۔ حدیقۃ العالم صفحہ ۲۶۵۔ تاریخ گولکنڈہ صفحہ ۱۱۵۔

حصّہ لیا۔ ان کو اس کی ذات سے ایک خاص دلبستگی پیدا ہو گئی تھی اور وہ اس کی بہبودی کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس حقیقت حال کی طرف انھوں نے اپنے ان قصائد میں بعض جگہ اشارے کئے ہیں جو سلطان محمد کی تخت نشینی کی تہنیت میں لکھے گئے تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

از دعا گوئے چو مؤمن ہم دعا بہتر کہ ہست　　　　او کہن داعی و تو شاہ جہانبان نوی

یعنے (دوسرے دعاگویوں کے مقابلہ میں) مؤمن جیسے دعاگو کی دعا تیرے لئے بہتر ہے

کیونکہ وہ تیرا پرانا (بہی خواہ اور) دعا کرنے والا ہے اور تو اس کا نیا بادشاہ ہے۔

اس کے علاوہ میر صاحب نے اپنے قصیدوں میں سلطان محمد قطب شاہ کے لئے اس خلوص و محبّت سے دعائیں مانگی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کوئی اپنی ہی عزیز اولاد کے لئے دعا کر رہا ہے نہ کہ کسی سرپرست و محسن بادشاہ کے لئے۔

میر جملہ کا تقرر

اس سے قبل تاریخ فرشتہ وغیرہ کے بیان سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ جملہ امور میں میر صاحب ہی کی رائے و مشورہ پر عمل پیرا تھا۔ لیکن اس حقیقت حال کا سب سے بڑا ثبوت مرزا محمد امین میر جملہ کے تقرر کا واقعہ[1] ہے۔ اس اہم واقعہ کی نسبت ہم اپنی کتاب حیات محمد قلی قطب شاہ سے حسب ذیل اقتباس کے اندراج ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

"جس وقت مرزا محمد امین حیدرآباد آیا ہے تو محمد قلی قطب شاہ کا عہد حکومت ہمہ جہتی ترقیوں کے لحاظ سے معراج کمال پر پہنچ چکا تھا۔ اور اس کے میر جملہ ملک امین الملک الف خاں کو بھی انتقال

---

[1] دیکھو تاریخ محمد قطب شاہی ورق ۲۶۱۔

گئے ہوئے دو تین سال گذر چکے تھے۔ یہ عہدہ خالی تھا اور سوری راؤ شاید منصرمانہ طور پر یہ خدمت انجام دیرہا تھا۔ لیکن بقول تاریخ قطب شاہی جیسا کہ چاہئے مملکت کا انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ اور محمد قلی کسی قابل آدمی کی تلاش میں تھا۔

اس موقعہ پر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے جملہ اعیان دربار اپنے اپنے دوستوں اور محسنوں کے لئے کوشش کر رہے تھے لیکن میر مومن پیشوائے سلطنت نے مرزا محمد امین کو اس خدمت کے لئے منتخب کیا اور محمد قلی نے یہ سفارش قبول کر کے ۱۰۱۱ھ میں مرزا کو اپنا جملۃ الملک بنالیا۔ اور اس کے لئے ایک ایسا بیش بہا قلمدانِ وزارت روانہ کیا جو اعلیٰ درجہ کے جواہر سے مرصع تھا۔"[1]

مرزا محمد امین کے عہد میر جملگی کی غیر معمولی کامیابی اور اس کے اعلیٰ ذوق و شائستگی اور عظیم الشان دعوت کے تفصیلی حالات حیات محمد قلی قطب شاہ میں درج ہیں۔ ایک ایسے عالی مرتبت شخص کو میر جملگی کی خدمت کیلئے منتخب کرنے سے پتہ چلتا ہے[2] کہ میر صاحب کیسے مردم شناس اور قدردان اہل کمال تھے ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ اہل کمال کی تلاش میں رہتے تھے اور ایران سے اکثر علما و فضلا کو حیدرآباد آنے کی دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ تاریخ عالم آرائے عباسی میں خود میر صاحب ہی کی زندگی میں لکھا گیا تھا کہ

"اکنوں کہ ایں صحیفہ تسوید می یابد و سنہ ہجری بخمس و عشرین والف رسیدہ در قید حیات است

---

۱ تفصیل کے لئے دیکھو حیات محمد قلی قطب شاہ صفحہ ۲۴۳ تا ۲۵۵ ـــ

۲ تاریخ دربار آصف گلزار دوم صفحہ ۱۹۱ ـ

وستحقین ہر دیار بوسیلۂ جناب میر سلسلۂ علیہ انتفاع می یابند"[1]

مرزا محمد امین کی طرح میر صاحب نے ایک اور رفیع المرتبت شخصیت علامہ شیخ محمد ابن خاتون کی بھی دستگیری کی تھی جس کا تذکرہ اس کتاب کی تیسری فصل میں درج ہے۔

حیات بخشی بیگم کی شادی

مرزا محمد امین کے تقرر کی وجہ سے اگرچہ حضرت میر مومن کو امور سلطنت سے یک گونہ اطمینان اور فرصت حاصل ہو گئی تھی لیکن ہر اہم معاملہ میں ان کو ضرور دلچسپی لینی پڑتی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کے ایک سال بعد ہی جب شاہ عباس صفوی نے اغزلو سلطان کو اپنا سفیر بنا کر حیدر آباد روانہ کیا[2] تو پھر میر مومن کو سیاست کے عملی میدان میں نکلنا پڑا۔ کیونکہ اس سفارت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ محمد قلی قطب شاہ کی دختر حیات بخشی بیگم کو شاہ ایران کے فرزند کے عقد نکاح میں دینے کی بابت بات چیت کی جائے۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں اس پیام کو قطب شاہی سلطنت کے لئے ایک غیر معمولی اعزاز قرار دیا گیا ہے اور چونکہ فرشتہ کی تصنیف کے وقت تک شاہ ایران کا ایلچی گولکنڈہ ہی میں موجود تھا اور حیات بخشی بیگم کی شادی نہیں ہوئی تھی اس لئے ابو القاسم فرشتہ کو تو یقین تھا کہ اس شہزادی کی شادی ایران کے شہزادہ سے ضرور ہو گی اور اسی یقین کی بنا کر اس نے یہاں تک لکھدیا کہ محمد قلی قطب شاہ نے شاہ عباس صفوی کی خواہش منظور کر لی اور اپنی دختر کو ایران بھجوانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اسکے الفاظ ہیں:۔

"از جملۂ توصیفات آسمانی وعنایات یزدانی در شامل روزگار آں شہریار محب اہل بیت

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی صفحہ ۱۵۹ — [2] اس سفارت کے تفصیلی واقعات کے لئے دیکھو حیات محمد قلی قطب شاہ صفحات ۳۱۴ تا ۳۱۸ —

شدہ این است کہ ازاں زماں کہ آفتاب رایت اسلام از افق ہندوستان طالع گشتہ
ہیچ کس از سلاطین سابق و لاحق آں ادیار رانسبت وصل و پیوند با پادشاہاں عظیم الشان
ایران دست ندادہ ۔ دریں عصر میمنت از آں شہنشاہ قباد بخت جمشید تخت عباس پادشاہ
والی ایران یکے از معتمدان درگاہ عرش اشتباہِ خود را بدکن فرستادہ صبیۂ فرماندہ تلنگ
راجہت ازدواج و ہم بستری یکے از اولاد امجاد خود خواستگاری فرمود ۔ آں حضرت شرف دنیا
و آخرت در قبول آن دانستہ درسامان و استعداد آن ست کہ آں کریمۂ سعادت مند را
بروشِ سلاطینِ کامگار روانہ ایران سازد۔[1]

کوئی تعجب نہیں کہ ابتداء میں محمد قلی قطب شاہ بقول فرشتہ راضی ہوگیا ہو لیکن بعد کو حضرت میر مومن کے مشورے سے اس کو اپنی رائے بدل دینی پڑی ۔ کیونکہ حیات بخشی بیگم اس کی اکلوتی لڑکی تھی ۔ اور اس کو خود سے جدا کرنا محمد قلی جیسے باپ کے لئے گوارانہ تھا اور اس شادی میں دوسری قباحت یہ تھی کہ چونکہ محمد قلی کے اولاد نرینہ نہ تھی اِس لئے اس کے بعد اُس کی وراثت اور جانشینی کا مسئلہ بھی درپیش ہونے والا تھا ایک طرف تو محمد قلی کا حقیقی بھائی شہزادہ خدابندہ سلطنت کا سب سے پہلا حقدار تھا اور دوسری طرف محمد قلی کا بھتیجا شہزادہ محمد بھی اس کا مستحق تھا کیونکہ اس کو بادشاہ نے بچپن سے اپنی نگرانی میں خود اپنے بچہ کی طرح پرورش کیا تھا لیکن حقیقی بھائی خدابندہ کی موجودگی میں بھتیجے کی کامیابی کے مواقع کم تھے ۔ خاصکر جب یہ بھی معلوم تھا کہ خدابندہ حیدرآباد کے سنی امراد مشائخین میں بہت

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۷۴ ۔

مقبول ہے اور ان سب کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح خدابندہ کو بادشاہ بناکر ایرانیوں کے مقابلہ میں دکنیوں اور سنیوں کی حکومت قائم کریں۔ چنانچہ اس واقعہ سے متعلق خود تاریخ محمد قطب شاہی جیسی مستند ومعتبر کتاب میں حسب ذیل عبارت درج ہے:۔

"اکثر اعیان دکنی را بکمند دعوت درآوردہ مواضعہ کردند کہ بوقت فرصت آسیبے بخاقان زماں رسانیدہ جماعت غریباں را ازپائے درآوردہ خدابندہ را بر سریر سلطنت اجلاس فرمایند ومملکت را بقبضہ تصرف خود درآوردہ[1]...."

اس طرح سے خود میر مومن اور مرزا محمد امین اور ان کے طرف داروں کے لئے بڑا خدشہ پیدا ہوگیا تھا۔ ان حالات کے تحت میر صاحب کا خاموش رہنا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار لینا تھا۔ یوں بھی وہ ابتدا ہی سے شہزادہ محمد کے طرفدار اور بہی خواہ تھے۔ اور اس کی پیدایش کے وقت ہی انہوں نے اس کی بادشاہت کی پیشین گوئی کردی تھی۔ اور یہ بات ممکن نہ تھی جب تک شہزادہ محمد کو شہزادہ خدابندہ کے مقابلہ میں کوئی امتیاز نہ حاصل ہوجاتا اور یہ امتیاز صرف داماد بننے ہی سے پیدا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ میر صاحب نے کوشش کرکے حیات بخشی بیگم کی شادی شہزادہ محمد سے کرادی اور ساتھ ہی جانشینی کا مسئلہ بھی طے ہوگیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادہ خدابندہ بھائی سے ناراض ہوگیا۔ اور اس کے خلاف بغاوت کی جس کے واقعات حیات محمد قلی قطب شاہ میں تفصیل سے درج ہیں[2]۔

---

[1] دیکھو ورق ۲۰۱ ا و ب ۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھو حیات محمد قلی قطب شاہ صفحات ۲۹۳ تا ۲۹۸ و ۳۱۷ ۔

حضرت میر مومن نے سفیر ایران کو پانچ سال روکے رکھا تاکہ اس کی موجودگی ہی میں حیات بخشی بیگم کی شادی شہزادہ محمد سے ہو جائے ۔ یہ تقریب بڑی عجلت اور خاص اہتمام سے ١٠١٦ھ میں منائی گئی۔ اور خود اغزلو سلطان سفیر ایران نے بھی اس میں شرکت کی۔ اس طرح شاہ عباس صفوی کے پیام کا جواب دینے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اور کوئی بدنمائی بھی پیدا نہ ہوسکی۔ کیونکہ یہ بیان کیا گیا کہ شہزادی بچپن ہی سے شہزادہ سلطان محمد سے منسوب تھی اور اسی لئے بادشاہ نے اس کی تربیت خاص اپنی نگرانی میں کی اور ظل اللہ کا لقب عنایت کرکے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ میر صاحب کی اس تدبیر سے اگرچہ شاہ ایران کے پیام کا خود بخود جواب مل گیا لیکن بادشاہ کے حقیقی بھائی خدابندہ کی بڑی دلشکنی ہوئی اور جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے یہ دلشکنی بغاوت کی شکل میں رونما ہوئی۔

غرض سفیر ایران حیات بخشی بیگم کی شادی کے بعد ہی ١٠١٧ھ میں حیدرآباد سے ایران کی طرف روانہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض اس مقصد کے لئے اتنے عرصہ تک حیدرآباد میں ٹھہرا لیا گیا تھا۔ اور چونکہ بادشاہِ ایران کو معلوم ہوچکا تھا کہ اس کام میں میر صاحب ہی کا ہاتھ تھا اس لئے جب دوسری بار بادشاہ ایران نے اپنا سفیر حیدرآباد کو روانہ کیا تھا تو میر صاحب کے نام خاص طور پر ایک علحدہ فرمان لکھا جس میں اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ اس سفیر کو جہاں تک ہوسکے جلد حیدرآباد سے روانگی کی اجازت دلا دیجئے۔ شاہ ایران کے الفاظ ہیں:-

"می باید .... کہ بخلاف سابق توقیفِ ایلچی را دراں دیار جایز نہ داشتہ در روانہ نمودن رفعت پناہ موی الیہ اہتمام لازم داند۔ و نوعے نماید کہ بہ زودی روانۂ خدمت اشرف گردد۔"[1]

[1] چونکہ شاہ ایران کا یہ فرمان حضرت میر مومن کے نام سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں آیا تھا اسلئے اسکا تفصیلی تذکرہ آئندہ باب میں درج ہے۔

تیسرا حصّہ

دیہات و جاگیرات

دیہات کی آبادی اور مسجدوں کی تعمیر

میر صاحب کے اُن مکانات اور دائرہ کی تعمیر کا تذکرہ تو گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے جو انھوں نے شہر حیدر آباد میں بنائے تھے۔ لیکن شہر کی اس تعمیر و تزئین سے ان کے ذوق تعمیر کی سیری نہ ہو سکی تھی۔ اِس کے علاوہ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے اندرونی حصّوں میں بھی ثقافتی ترقی ہو اور دیہات کے باشندے بھی اسلام سے روشناس ہو سکیں۔ اِس لئے انھوں نے شہر سے باہر کئی زمینات اور گاؤں خریدے اور ان میں تالاب، مسجدیں، عاشور خانے، سرائیں، اور دیگر عمارتیں بنوائیں جن کے اطراف ثمرہ دار[1] درختوں کے باغ لگائے اور طرح طرح کی ترغیب و تحریص سے[2] لوگوں کو آباد کیا۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا دیہات بسانے اور ان میں عالی شان مسجدیں اور عاشور خانے بنانے میں میر صاحب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سرزمین دکن میں دور دور تک اسلام کی روشنی پھیل جائے۔ اور شہر کے علاوہ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے رہنے بسنے والے بھی اسلام کی شان و شوکت اور اسلامی رسوم و تمدن سے واقف ہو سکیں۔ چنانچہ ان کی مسجدیں اور عاشور خانے اندرون ملک کے پہاڑوں، چٹیل میدانوں، اور سنسان جنگلوں میں دیہاتی زندگی بسر کرنے والوں میں اب تک ایک خاص عظمت و عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں سے زیادہ ہندو ان مسجدوں اور عاشور خانوں کا احترام کرتے ہیں جس کا تفصیلی حال میر صاحب کے تصرفات کے

---

[1] عبداللہ قطب شاہ نے بھی اپنے فرمان میں میر صاحب کے ناریل اور ثمردار درختوں کے باغوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ فرمان میر صاحب کی اولاد کے بیان میں نقل کیا جائے گا۔

[2] چنانچہ ملاتیمی کو پچیس بیگھے زمین بطور انعام دیکر سید آباد میں آباد کرنے کا ذکر آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہو۔

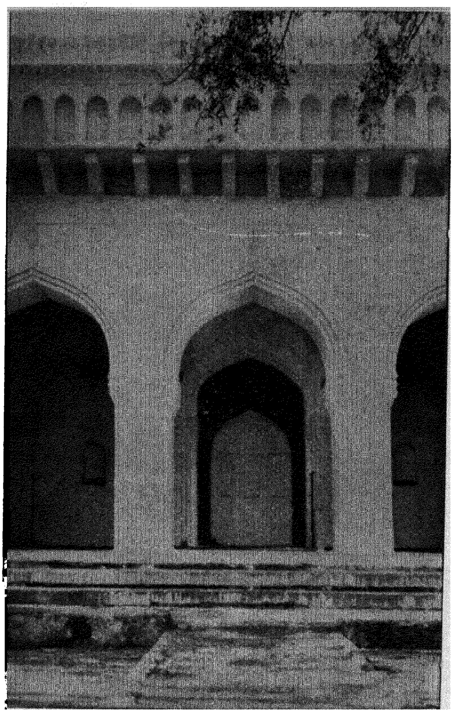
بیان میں درج ہے۔ غیر مسلموں کے علاوہ میر صاحب خود عام مسلمانوں کے دلوں میں بھی محبِ اہل بیت نبی اور آئمہ معصومین و سادات کے احترام و اہتمام کا خیال غیر ارادی طور پر پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کا ذکر انھوں نے اس خط میں کیا ہے جو شاہ عباس صفوی والی ایران کے فرمان کے جواب میں سلطان محمد قطب شاہ کے ابتدائی عہد حکومت میں حیدر آباد سے روانہ کیا گیا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"وتسلی خاطر باین ست کہ درین حدود و کشور مساجد و منبر بعد از تزئین بذکر اسامی مبارکۂ حضرات عالیات چہار دہ معصوم مزین و مشرف بنام نامی و القاب گرامی آں شہنشاہ والا گہر دین پناہ عدالت گستر و آباء کرام قدسی مقام آں نور بخش ہفت کشور است"[1]

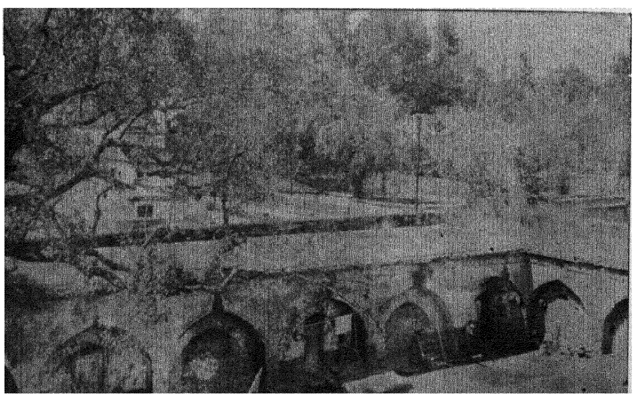
اس حقیقت حال سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علموں اور تعزیوں کے رائج کرنے میں مذہبی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کا سیاسی مسلک بھی کام کر رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دکن کے عام مسلمانوں کے علاوہ یہاں کی بت پرست اقوام کو علموں اور تعزیوں کے ذریعہ سے اسلام سے مانوس کریں تاکہ وہ رفتہ رفتہ اپنے بتوں اور رتھوں کو چھوڑ کر علموں اور تعزیوں اور تابوتوں کی طرف مائل ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقصد میں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ میر صاحب نے اپنے گاؤں میر پیٹھ میں جو عاشور خانہ بنایا تھا اس کے منہدمہ آثار میں اب بھی ہر سال ہندو ہی بڑے اعتقاد کے ساتھ علم بٹھاتے ہیں۔ اسی طرح اطراف و اکناف کے اکثر دیہات میں بھی مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم لوگ ہی ایام عاشورہ کا احترام کرتے ہیں۔

---

[1] حدائق السلاطین ورق ۱۹۳۔



سید آباد
کی
مسجد اور سرا ۔ ے



سید آباد میر صاحب کی بسائی ہوئی آبادیوں میں سب سے پہلے موضع سید آباد کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہ شہر سے قریب تر واقع ہے۔ یہ گاؤں میر صاحب نے حیدر آباد کی جانب مشرق خود اپنے دولت خانہ سے صرف تین چار میل کے فاصلہ پر بسایا تھا۔ اس کا نام مرور ایام کی وجہ سے مسخ ہوتے ہوتے اب سعدا باغ بڑ گیا ہے۔ میر صاحب کے مکان سے اس آبادی تک سیدھی سڑک بنائی گئی تھی اور اس سڑک پر اور چند میل آگے بعد کو سلطان محمد قطب شاہ نے قلعہ سلطان نگر اور اسکی ملکہ حیات بخشی بیگم نے شہر حیات نگر بنایا تھا۔ اول الذکر تو نامکمل رہا لیکن موخر الذکر اب تک آباد ہے۔

سید آباد کی مسجد اور سرائے سید آباد میں میر صاحب نے ایک پختہ اور بلند مسجد اور اس کے اطراف ایک عالیشان سرائے بھی بنائی تھی۔ مسجد تو ایک حد تک اب بھی محفوظ ہے لیکن سرائے بہت شکستہ ہوگئی ہے اور اب صرف اس کا وہ حصّہ باقی ہے جو مسجد کے عقب میں واقع ہے۔ پہلوؤں کی طرف کی عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ البتہ شمالی سمت کے چند کمرے بچ گئے ہیں۔ اگرچہ بعد کو قدیمی راستے وغیرہ باقی نہ رہے لیکن اب بھی مسجد تک موٹر جا سکتی ہے۔ یعنے نواب سر امین جنگ کے مکان کے مقابل جو راستہ جنوب کی طرف جاتا ہے اس پر تھوڑی دور جانے کے بعد اگر جانب مشرق مڑیں تو پہلے میر صاحب کی سرائے اور پھر مسجد نظر آجاتی ہے۔ یہ مسجد اب بھی آباد ہے اور اس میں متعدد نل ہیں جن سے دن بھر آبادی کی ہندو مسلم مستورات پانی لے جاتی رہتی ہیں۔

میر صاحب نے مسجد اور سرائے کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اُن کی حفاظت اور خدمت وغیرہ کیلئے اخراجات کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ انھوں نے اس مسجد کی نگرانی کی خدمت ملا تیمی کے سپرد کی تھی جو غالباً ایک بڑے عالم یا شاعر تھے کیونکہ قطب شاہی عہد میں صرف ممتاز لوگوں کے نام کے ساتھ ملا کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً

ملا وجہی اور ملا غواصی وغیرہ۔ یہ دونوں بھی حضرت میر مومن کے ہمعصر اور بڑے شاعر تھے۔ غرض ملا تمیمی کو مسجد و سرائے کی خدمت سپرد کر کے اِسی موضع سید آباد میں پچیس بیگھے زمین انعام میں دی گئی تھی تاکہ وہ اور ان کی اولاد اس معاش کی وجہ سے ہمیشہ وہاں قیام پذیر رہیں اور مسجد اور خانقاہ کی خدمت کرتے رہیں۔ چنانچہ میر صاحب کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد کی ایک تحریر راقم کی نظر سے گذری جس سے پتہ چلتا ہے کہ ملا تمیمی کی اولاد اُس وقت تک برابر یہ خدمت انجام دے رہی تھی۔ اس میں لکھا ہے :۔

"من کہ سید حسین ولد سید جلال داماد سید محمد بن سید لار محمد بن شاہ محمد بن ملا تمیمی انعام دار تعلقہ سعدا باغ سیوار موضع انوارم[1] پرگنۂ حویلیٔ فرخندہ بنیاد سرکار محمد نگر اقرار معتبر می کنم و نوبن می دہم بریں وجہ کہ موازی بست و پنج بیگہ خارج جمع، بہ شرط خدمت و صرف ضروریات مسجد پختہ و مکاکین بنا ساختۂ میر محمد مومن صاحب مغفور واقع تعلقہ سعدا باغ مذکور سیوار مذبور بموجب اسناد قدیم و جدید و پروانہ جات ناظمان و دیوانیان، وصدور صوبۂ مقرر بہ نام من و بزرگان من تا الی الآن از اراضی مذکور قابض و منصرف بودہ خدمت مسجد مذکور بجا می آرم ...." الی آخرہ[2]

یہ تحریر غرہ جمادی الاول ۱۱۸۷ھ کو لکھی گئی تھی اور اس پر حسب ذیل حضرات کے دستخط اور مہریں بھی ثبت ہیں۔

---

[1] اس کو اب گڈی انارم کہتے ہیں۔

[2] یہ اقرار نامہ مولوی میر عباس علی صاحب نبیرہ حضرت میر محمد مومن کے یہاں اب بھی محفوظ ہے۔

محمد علی　　سید حسین ولد سید جلال　　محمد شاکر بیگ　　محمد باقر　　سید مرتضیٰ

حاجت روا محمد مشکل کشا علی　　۱۱۷۰ھ　　۱۱۸۳ھ　　۱۱۶۲ھ　　۱۱۸۳ھ

۱۱۱۶ھ

معانی حسین　　خواجہ محمد عظیم حسینی　　سید یوسف علی خاں　　میر ابو طالب

اور کاغذ کے سرلوح پر حکیم محمد معصوم خاں فدوی نظام الملک آصفجاہ ۱۱۴۵ھ کی مہر بھی ثبت ہے۔

اس اقرار نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک موضع سید آباد یا سعدا باغ خود میر محمد مومن کے ورثا کے قبضہ سے نکل چکا تھا۔ اور اب وہ (یعنی "میر محمد حسین و میر کاظم علی ابنان میر سید محمد مرحوم و مساۃ خدیجہ بیگم ورثہ میر محمد مومن") کم از کم اس مسجد، سرائے اور اس سے متعلقہ مکانوں پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ گاؤں کس وقت اور کیوں حضرت میر مومن کی اولاد سے لے لیا گیا تھا ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا البتہ ۱۱۰۶ھ کے ایک محضر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خود قطب شاہی دور میں میر مومن صاحب کی جملہ جاگیرات اور زمینات ان کی اولاد سے چھین لی گئی تھیں اور یہ ابوالحسن تاناشاہ کے آخری زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ مادنا اور اکنا کی عملداری تھی۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر اس وقت ایک قدیم محضر ہے جس میں لکھا ہے:—

سوال می کند و استدعائے ادائے شہادت می نماید اقل العباد اللہ سید محمد و مساۃ شاہ بیگم و مساۃ زہرا شاہ و مساۃ فخر النسا بیگم و مساۃ خیر النسا وغیرہ نبیرہائے جنت مکانی فردوس آشیانی میر محمد مومن پیشوائے قطب الملک .... بعد از پدرم ماہائے مقررین طفلان و تیتیان بیوہائے بے کس و بے وسیلہ دیدہ مادھو زنار دار از راہ تعدی

ظلم صریح نمودہ ہمہ دیہات انعام راتعلق بتِ خانۂ خود کردہ ومساجد آں جد بزرگوار مطلق بے چراغ نمودہ............ جمع کثیر سادات بیوہائے ذریۂ طیبۂ طاہرۂ میر محمد مومن از قوت لا یموت محتاج اند۔ حق ایں سادات مستحقین دستبند نالا بہا ومحصول اشجار از راہ تعدی کافراں می خورند چنانچہ اسناد قدیم وحال بدست داریم حق بحقدار نمی رسد۔ مساجد[ب] جدم بزرگوار را بے چراغ کردند۔"

یہ محضرہ رمضان ۱۱۰۶ھ کو لکھا گیا تھا اور اس پر متعدد اصحاب کے دستخط اور مہریں ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

سید احمد بن سید رحمت اللہ	بندہ درگاہ یوسف بن ایتوں	عبداللطیف بن محمود
۱۰۹۹ھ	۱۰۹۷ھ	۱۱۱۲ھ
صدر الدین سید محمد محمود	رفیع الدین منشی عالمگیر شاہ	علی بیگ ولد حسین بیگ
۱۱۱۰ھ		
ہدایت اللہ ولد نعمت اللہ	خان زماں بندہ عالمگیر بادشاہ	
۱۱۱۷ھ	۱۰۷۳ھ	

غرض اس محضر نے ظاہر کر دیا کہ میر صاحب کی وفات کے صرف اٹھاون سال بعد ہی ان کے بسائے ہوئے گاؤں اور خریدی ہوی زمینات دوسروں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ یہ واقعہ ۱۰۹۲ھ کے بعد

ا۔ یہ محضر بھی مولوی میر عباس علی صاحب کے یہاں محفوظ ہے۔ اور اس میں لفظ موزنار دار سے مراد یقیناً دیوان ماذنا ہے۔

وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس سنہ میں ان کے پوتے میر محمد جعفر ابن میر مجدالدین محمد زندہ تھے جن کی نسبت علی ابن طیفور بسطامی نے اپنی تاریخ حدائق السلاطین (مولفہ ۱۰۹۲ھ) میں لکھا ہے :-

"پسر او (یعنے مجد دین محمد) سید حمیدہ سیر فضیلت گستر سید جعفر"[1]

اور ان سید جعفر کے نام اس تاریخ کی ترتیب سے صرف ۲۴ سال قبل میر محمد مومن کی جملہ جاگیرات اور زمینات کی بحالی کا فرمان سلطان عبداللہ قطب شاہ نے ان الفاظ میں جاری کیا تھا :-

"سال بسال در وجہ انعام باولاد و احفاد میر مرحوم الی ماتوالد و تناسل مرحمت فرمودیم۔ و بارز مواضع مذبور را در وجہ انعام نبیرہائے میر مذکور بحری دانستہ و ملک و میراث و مواضع مسطور بتصرف میر محمد جعفر وغیرہ نبیرہائے میر مرحوم واگذارند۔ و از کل تکلیفات دیوانی وکل قانون قدیمی و جدیدی اسمی و رسمی معاف دانستہ متعرض و مزاحم حال نگردند۔ و ہرکس ازراہ طمع بخلاف مضمون این فرمان عنایت عنوان تبدیل و تحریف جائز دانستہ بمواضع مذبورہ انعام میر سابق الذکر مزاحم شود بغضب و سخط آفریدگار گرفتار آید..... الی آخرہ"[2]

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے یہ آخری الفاظ بالکل صحیح ثابت ہوئے اور ما دنا دیوان پر غضب الہٰی نازل ہوا کیونکہ اس نے اس صریح فرمان کے خلاف سید محمد جعفر کی وفات کے بعد ہی میر صاحب کی تمام جاگیرات اور زمینات چھین لیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہر طرح کے انقلابات اور گردش ایام کے باوجود سید آباد میں

---

[1] ورق ۱۹۱ ا ۔ [2] یہ فرمان بھی موجود ہے اور اس کا فوٹو اس کتاب میں شریک کیا گیا ہے۔

میر صاحب کی بنائی ہوئی مسجد اب تک سربلند ہے اور اپنے بنانے والے کی الوالعزمی کا ثبوت دے رہی ہے۔ اس کی شاندار محراب سنگ موسیٰ سے بنائی گئی ہے جس پر ایک اعلیٰ درجہ کا کتبہ بھی نصب ہے۔ یہ نفیس اور خوشنما خط ثلث میں لکھا گیا ہے اور سرزمین دکن کے بہترین کتبوں میں شمار پا سکتا ہے۔

میر صاحب کا کتبہ

اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے یہ مسجد اور سرائے ۱۰۱۴ھ میں بنائی تھی۔ یہ ان کے پہلے دور پیشوائی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس کی تعمیر سے دو تین سال قبل ہی انہوں نے مرزا محمد امین کو میر جملگی دلائی تھی جس کی دلچسپی اور مستعدی کی وجہ سے میر صاحب کو مہمات سلطنت سے کچھ فرصت مل گئی تھی۔ اور وہ اب شہر سے باہر اسلامی یادگاروں کی تعمیر کے لئے وقت نکال سکے تھے۔

اس مسجد کا مسقف حصہ ۳۰ فیٹ طویل اور ۲۱ فیٹ عریض ہے۔ اس میں تین کمانیں ہیں۔ اور اس کی محراب پر جو سنگ موسیٰ میں بنائی گئی ہے مولنا حسین ابن محمود شیرازی کا ایک نفیس کتبہ درج ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔[1]

محراب کی انتہائی بلندی پر قَالَ اللہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالیٰ اور اس کے نیچے ایک سیدھی سطر میں قرآن شریف کے سترھویں سورہ الاسریٰ کی بیسویں آیتہ یعنے

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعیٰ لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَشْکُوْرًا کندہ کیا گیا ہے۔ اور اس کتبے کے درمیان میں اوپر کی طرف اٹھا کر وھو مومن لکھا گیا ہے جس سے شاید مسجد کے بانی کا نام ظاہر کرنا بھی مقصود تھا۔ میر مومن صاحب نے محراب میں اپنا نام و نشان صریحی طور پر کندہ کرانا مناسب خیال نہ کیا کیونکہ ایک تو وہ غالباً نام و نمود نہیں چاہتے تھے اور دوسرے

---

[1] اس کتبے کے صحیح پڑھنے میں مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات نے مولف کی خاص مدد فرمائی۔

یہ کہ ایسی جگہ جس کی طرف تمام مصلیوں کو نماز کے وقت رُخ کرنا پڑتا تھا کسی شخص کا نام مندرج ہونا احترام مسجد اور آدابِ نماز کے خلاف بھی تھا۔

اس آیتہ کے نیچے محرابُ کے بالکل اوپری حصّہ کو تین حصوں یا تختیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلی تختی میں لکھا ہے۔ عجلوا بالصلوٰۃ قبل الفوت

درمیانی تختی میں لکھا ہے۔ ربنا تقبل منا بآل النبیؑ ۱۰۱ھ

تیسری تختی میں لکھا ہے۔ وعجلوا بالتوبۃ قبل الموت

محراب کے دونوں پہلوؤں میں درود شریف کندہ کیا گیا ہے۔ درمیانی کمان کی دائیں طرف نیچے سے اوپر لکھا ہے:۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی المُصْطَفٰی مُحَمَّدٍ وَالمُرْتَضٰی عَلی وَالبَتُول فَاطِمَۃَ وَالسِبْطَیْن الحسن والحسین وَصَلِّ عَلٰی زین العبَاد علی وَالبَاقِر مُحَمَّد وَالصَادق جعفر وَالکَاظم مُوسیٰ والرِضَا علی وَالتقی محمّد وَالنقی عَلی وَالزکی العَسکَری الحسن

کمان کی بائیں طرف اوپر سے نیچے:۔

وَصَلِّ عَلٰی الحجۃ القائمۃ الخلف الصَالح الامام الھمام والمنتظر المظفر مُحَمّد المھدی الھَادی صَاحب العَصْر والزمان وخلیفۃ الرحمٰن الانس والجان والمظھر الایمان صَلوات اللہ وسَلامہ عَلَیہ

وَعَلَیۡھِمۡ اَجۡمَعِیۡنَ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ[1] نمقه عبده حسین شیرازی

مولنا حسین شیرازی

ابھی یہ معلوم ہوا کہ میر محمد مومن صاحب کی مسجد میں جو کتبہ ہے وہ حسین شیرازی کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ میر صاحب کی دوسری مسجدوں کے کاتب بھی یہی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ کتبہ کے سلسلہ میں ان کا کچھ حال درج کیا جائے۔ اس کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کے لکھے ہوئے کتبے اور کہیں اب تک نظر سے نہیں گذرے اور دوسرے اس لئے کہ یہ میر صاحب کے خاص دست گرفتہ تھے اور انھوں نے اپنے اس محسن کی مہربانی اور سرپرستی کی وجہ سے حیدرآباد میں ایک بہت اچھا مرتبہ حاصل کیا تھا۔

سیدآباد کی مسجد کے کتبے میں انھوں نے اپنا نام صرف حسین شیرازی لکھا ہے لیکن میر پیٹھ کے کتبہ میں

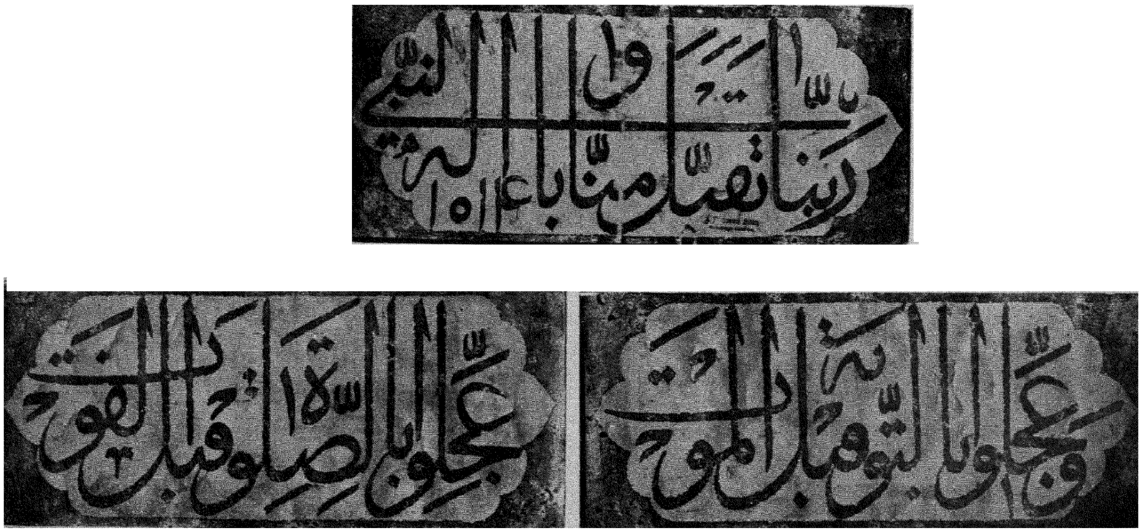
"عبدہ حسین بن محمود الشیرازی ۱۰۲۰ھ"

درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ ان کے والد کا نام محمود شیرازی تھا۔ ان کے حالات اور کتبوں کی تلاش کے سلسلہ میں حدیقۃ السلاطین اور حدیقۃ العالم میں منتشر سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جن کو تسلسل کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

---

[1] اس درود اور سلطان قلی قطب شاہ والی سلطنت گولکنڈہ کی قبر کے مندرجہ درود کے الفاظ تقریباً ایک ہی ہیں لیکن سلطان محمد قلی قطب شاہ کے سنگ مزار پر جو درود کندہ کرایا گیا ہے اس کے آخری حصہ کے الفاظ میں کچھ تبدیلی کر دی گئی ہے یعنے اس پر لکھا ہے:۔

"الامام الہمام المنتظر المرتضی محمد بن الحسن صاحب الزمان قاطع البرہان ومظہر الایمان وسید الانس والجان صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم اجمعین"



میر محمد مومن کی بنائی ہوی مسجدوں کے محرابوں کے اوپر کے کتبے ۔ درمیانی کتبہ میں سنہ تعمیر بھی درج ہے ۔
یہ سب کتبے مولانا حسین شیرازی کے لکھے ہوئے ہیں ۔

مولنا حسین تقریباً ۹۵۵ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ ۱۰۳۵ھ کے اوائل میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ حدیقۃ العالم میں لکھا ہے :۔

"مشار الیہ کہ ہشتاد مرحلہ از مراحل زندگانی طے نمودہ بود رخت اقامت ازیں سرائے فانی بربست"[1]

یہ تقریباً بینتالیس سال کی عمر میں حیدرآباد آئے اور اُن ایرانیوں میں سے ہیں جو میر صاحب کے توسط سے محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے۔ ایسی ہی مثالوں کو پیش نظر رکھ کر مصنف عالم آرائے عباسی نے ۱۰۱۵ھ میں میر صاحب کے متعلق لکھا تھا :۔

"مستحقین ہر دیار بوسیلۂ جناب میر از سلسلۂ علیہ انتفاع می یابند"[2]

غرض میر محمد مومن بڑے جوہر شناس تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس جوہر قابل کو بھی پرکھ لیا اور محمد قلی قطب شاہ کے دار الانشاء اور کتب خانہ میں مامور کرا دیا۔ حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے :۔

"در سلک کتاب ایں دولت خانۂ عالیہ منتظم بود"[3]

یہ خدمت اور میر صاحب کی مسجدوں کے خوبصورت کتبے ظاہر کرتے ہیں کہ مولنا حسین اعلیٰ درجہ کے خطاط اور خوشنویس تھے۔ لیکن تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض خوشنویس ہی نہ تھے بلکہ نہایت

---

[1] دیکھو حدیقۃ العالم صفحہ ۲۷۷ [2] دیکھو مطبوعہ صفحہ ۱۵۹۔ لیکن اس کے ایک قلمی نسخے میں جو مولوی قاسم علی بیگ صاحب انگر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس عبارت میں کچھ اختلاف ہے۔ اس میں لکھا ہے : "مستحقین ہر دیار بوسیلۂ او از سلسلہ قطب شاہیہ تمتع می یابند"۔ [3] حدیقہ صفحہ ۱۰ ۔

متقی، پرہیزگار سلیم الطبع اور نیک خو بھی تھے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"بصلاح جبلی وسلامت نفس اتصاف داشت[1]"

یہی وجہ تھی کہ اس عہد کے دوسرے مشہور خطاطوں مثلاً محمد اصفہانی، اسمٰعیل بن عرب شیرازی، تقی الدین محمد صالح البحرینی اور کلبِ علی بن محمد صادق وغیرہ کو چھوڑ کر میر صاحب نے اپنے کتبوں کے لئے ان کو منتخب کیا تھا۔

مولانا حسین عہد محمد قلی میں حیدر آباد ہی میں رہے اور اس کی وفات سے متاثر ہو کر نوجوان شہزادہ محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد جیسے اور بہت سے ایرانی علما و امرا مثلاً شیخ محمد ابن خاتون اور مرزا محمد امین میر جملہ وغیرہ نے حج و زیارت کی رخصت لیکر یا کوئی اور ضرورت پیش کر کے یا ہمیشہ کے لئے حیدرآباد سے ایران وغیرہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ مولانا حسین نے بھی حج اور زیارتوں کی غرض سے سفر کی اجازت حاصل کی۔ اور سنہ ۱۰۳۰ھ کے قریب اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے[2] جب میر مومن صاحب عبداللہ قطب شاہ کی تعلیم اور اتالیقی کے لئے کسی لائق اور بزرگ سیرت عالم کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ انکے واپس ہوتے ہی میر صاحب نے ان کو سلطان محمد کی بارگاہ میں پیش کر کے شہزادہ کی تعلیم پر مامور کرا دیا۔ نظام الدین احمد شیرازی نے لکھا ہے:۔

"رخصت رفتن به مکه معظمه حاصل نموده بشرف طواف بیت الله الحرام و سعادت زیارت مرقد مطهر

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰ و حدیقۃ العالم صفحہ ۲۷۶ — [2] حسین شیرازی کی واپسی کی تاریخ کا صحیح اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ شہزادہ عبداللہ مرزا کی تعلیم کے لئے اسی سنہ میں ایک قابل اتالیق کی تلاش کی گئی۔

خیرالانام و سایر عتبات طاہرات ائمہ کرام علیہم الصلوات اللہ الملک العلام مشرف و مستسعد و گردیدہ و درین وقت مراجعت نمودہ بود۔ بکبر سن و صلاح جبلی و سلامت نفس موصوف بود۔ نواب مرتضائے ممالک اسلام میر محمد مومن مولوی را بجہت این خدمت پسندیدہ مجدد آبشرف ملاقات خاقان زمان مشرف ساختہ بخلعت ایں خدمت عالی بہ قامت قابلیت مولوی مرتب داشتند۔"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب حسین شیرازی پر کتنے مہربان تھے۔ جس وقت (یعنی ۱۰۱۷ھ میں) حسین نے میر صاحب کی مسجد کا کتبہ لکھا تھا اس وقت ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگا کہ ایک روز ان خدمات کے صلہ میں میر صاحب ان کو اتنا بڑا اعزاز دلوائیں گے۔ غرض حسین شیرازی نے مبارک ساعت دیکھ کر اس خدمت جلیلہ کے کام کا آغاز کیا۔ اور شاہزادہ عبداللہ مرزا کے یہاں حاضر ہونے لگے۔

مولانا حسین کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی شاہزادہ کو پڑھنے لکھنے کی طرف راغب دیکھتے تو قرآن مجید کی تلاوت کراتے اور مذہبی مسائل و احکام سے آگاہ کرتے رہتے[2]۔ اس طرح دو سال کے عرصہ میں مولانا نے عبداللہ قطب شاہ کو قرآن مجید اور مذہب اسلام کا کافی مطالعہ کرادیا۔

جب یہ شہزادہ دس سال کی عمر کو پہنچا تو اس کے اتالیق خواجہ مظفر علی دبیر کا بھی انتقال ہوگیا۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے کہ پیدائش سے بارہ سال کی عمر تک جو شخص بھی شہزادہ عبداللہ کی خدمت لگی یعنے نگرانی و اتالیقی وغیرہ کے لئے مقرر کیا گیا وہ بہت جلد انتقال کرگیا۔ اس طرح کئی اچھے اچھے

---

[1] حدیقۃ صفحہ ۱۰ — [2] ایضاً ص۱۰

لوگ مثلاً میر قطب الدین نعمت اللہ شیرازی، مرزا شریف شہرستانی، اور میر محمد مومن اسی شہزادہ کی قربت، تعلق، اور خدمت میں راہی جادۂ فنا ہو گئے۔ اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا خواجہ مظفر علی کے بعد خود مولٰنا حسین شیرازی کا بھی یہی حال ہوا۔

غرض خواجہ مظفر علی کے انتقال کے بعد شہزادہ عبداللہ کو بالکلیہ طور پر مولٰنا حسین شیرازی کی نگرانی میں دیدیا گیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ کیونکہ ماہرین نجوم کی پیشین گوئی کے مطابق ولی عہد سلطنت اپنے باپ سلطان محمد کی نظروں سے اوجھل غیروں کے گھروں میں پرورش پا رہا تھا۔ جو اس کی موت و زیست اور اچھی اور بری نشو و نما کے بالکلیہ ذمہ دار تھے اسی لئے شروع ہی سے جن جن لوگوں کے یہاں شہزادہ کو رکھا گیا وہ بادشاہ کے خاص معتمد علیہ اور دربار کے معتبر اراکین میں سے تھے۔ اور چونکہ ان میں سے اکثر حضرت میر محمد مومن کی سفارش پر منتخب کئے گئے تھے اس لئے ان کا تذکرہ اور اس خدمت کی اہمیت کا حال آئندہ فصل میں جو عہد محمد قطب شاہ کے لئے وقف ہے درج رہے گا۔

خواجہ مظفر علی کی وفات کے بعد مولٰنا حسین اپنا مکان چھوڑ کر مظفر علی ہی کے مکان میں آرہے تاکہ رات اور دن ہمہ وقت شہزادہ کے قریب رہیں۔ خواجہ کے مکان میں شہزادہ کے لئے ایک رفیع الشان قصر بنایا گیا تھا جس کو تکلفات گوناگوں اور تصرفات موزوں سے سجایا گیا تھا[1]۔ اور خود خواجہ نے شہزادہ کی تشریف آوری کے وقت اس قصر میں زربفت اور ابریشم کو پائے انداز کر کے زر و جواہر نثار کیا تھا۔ اور شہزادہ کو خوش رکھنے اور اس کا دل بہلانے کی خاطر اپنے محل کو نگار خانہ چین بنا دیا تھا۔

---

[1] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹

مولٰنا حسین شیرازی جیسے متقی بزرگ کے مکان میں یہ تکلفات کہاں۔ اس لئے وہ خود اس محفل میں آرہے۔ اور شبانہ روز ایسی خدمت کی کہ سایہ کی طرح شہزادہ سے کبھی جُدا نہ ہوتے تھے۔ ان کی اس توجہ اور شفقت کی وجہ سے شہزادہ عبداللہ مرزا بھی انکا اتنا دلدادہ ہو گیا کہ ایک لمحہ کیلئے ان سے جدا نہ ہونا چاہتا تھا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں:۔

"ازین جہت شاہزادۂ عالم راکمال لطف وشفقت بجال مولوی بہم رسیدہ نمی خواستند کہ مولوی یک لحظہ از قدوم بہجت لزوم دوری نماید۔ وعلی الدوام مولوی بمراسم بندگی و خدمت قیام داشت"[1]۔

اسی اثناء میں شہزادہ نے گیارہواں سال ختم کرکے بارہویں میں قدم رکھا اور غالباً ذیقعدہ یا ذالحجہ ۱۱۳۰ھ میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ دروازوں میں سے گذر کر ایک عظیم الشان باغ میں داخل ہوا ہے جس کی سیر سے وہ محظوظ ہی ہو رہا تھا۔ کہ یکایک تمام درخت اس کو سجدہ کرنے لگے۔ اس کے بعد جدھر وہ جاتا اس طرف کے درخت اس کے آگے سر بسجود ہو جاتے۔

جب صبح کو شاہزادہ بیدار ہوا اور حسین شیرازی نماز صبح کے فرایض و نوافل اور اوراد و وظائف سے فارغ ہوتے ہی حسب عادت اس کے بستر پر آکر دعا و ثنا میں مشغول ہوا تو شہزادہ نے اپنے بوڑھے دوست سے رات کے خواب کا واقعہ بیان کیا۔ بوڑھا شفیق فوراً خواب کی تعبیر سمجھ گیا۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد اس نے عرض کیا کہ یہ خواب شہزادہ کی بادشاہت و سلطنت کی بشارت

---

[1] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰ ـــ

دے رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی تاکید کردی کہ یہ خواب اور اس کی تعبیر کسی سے بیان نہ کی جائے۔ مولٰنا حسین شیرازی نے جس پرخلوص انداز میں شہزادہ کو نصیحت کی تھی ذیل کے جملوں سے اس کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے :-

"این بیر حقیر خدمت گار متوقع است کہ باحدے ازملازمان این خواب را اظہار نہ فرمایند۔
و ایں معنی را در ضمیر اقدس مستور دارند تا جمال حقیقت این رویا از نقاب حجاب نہاں و ہیأت
ایں صورت زیبا در مرات شہود و عیاں جلوہ گر شدہ منظور انظار عالمیاں گردد۔"[1]

شہزادہ کو بھی اپنے اس مخلص استاد اور مشفق اتالیق کی بات کا اتنا خیال تھا۔ اس نے کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس واقعہ کو چند ماہ گذر گئے اور خود مولٰنا حسین شیرازی کو بھی دنیا سے کوچ کرنا پڑا۔

حسین شیرازی کی صحیح تاریخ و روز وفات تو معلوم نہ ہوسکا لیکن اتنا یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے میر محمد مومن کے چند ہی ماہ بعد یعنے اوائل ۱۰۳۵ھ میں (قبل ماہ جمادی الاول) وفات پائی۔ کیونکہ ان کی وفات کے دو تین مہینوں کے بعد ہی ۱۳ر جمادی الاول ۱۰۳۵ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کا بھی انتقال ہوا تھا۔

مولٰنا حسین کی وفات کا ان کے شاگرد اور معتقد شہزادہ عبداللہ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ تنہائی سے گھبرا گیا اور اپنے نادیدہ باپ سلطان محمد قطب شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے بار بار کہلا بھیجا

---

[1] دیکھو حدیقتہ السلاطین صفحہ ۱۳۔ و حدیقتہ العالم صفحہ ۲۷۷۔

شروع کیا چنانچہ مورخین لکھتے ہیں:۔

"بعد ازیں قضیہ (یعنی وفات حسین شیرازی) شہزادہ یوسف طلعت سکندر فطنت را تاب تنہائی نماند۔ و مترصد بودند کہ کلفت بعد و ہجر بالفت قرب و وصل مبدل و جمال باکمال والد ماجد فرشتہ خصال را بزودی مشاہدہ فرمایند[1]......"

سلطان محمد قطب شاہ بھی بارہ سال سے اپنے فرزند کے دیدار کا مشتاق تھا۔ وہ نجومیوں کے کہنے پر محض اس لئے عمل پیرا تھا۔ میر مومن صاحب نے بھی اپنے علم کے زور پر اس کی تصدیق کی تھی[2]۔ لیکن اب تو میر صاحب بھی باقی نہ رہے تھے۔ اس نے ہمت کر کے دن تاریخ مقرر کر لی اور بیٹے کو غالباً ماہ ربیع الاول میں اپنے یہاں بلا لیا۔ حالانکہ اس وقت تک پورے بارہ سال گذرنے نہ پائے تھے کیونکہ شہزادہ عبداللہ بروز دوشنبہ ۲۸ شوال ۱۰۲۳ھ کو پیدا ہوا تھا اور ۲۸ شوال ۱۰۳۵ھ کو قمری مہینوں کے حساب سے بارہ سال پورے ہوتے تھے[3]۔

اس ملاقات کا مہینہ ربیع الاول اس لئے قرار پاتا ہے کہ ملاقات کے چند ماہ بعد تک سلطان محمد

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۳۔ [2] نجومیوں نے کہا تھا کہ:۔ "چوں دوازدہ مرحلہ از مراحل عمر شہزادہ عالمیان طے شود باید کہ شہنشاہ دوران دیدہ بدیدار جمال شاہزادہ جہانیاں منور سازند۔ و اتفاق قران ثمین بعد از انقضائے سنوات مذکور وقوع پذیرد"۔ حدیقۃ السلاطین صفحہ ۶۔

[3] عجیب بات یہ ہے کہ نظام الدین احمد شیرازی نے اس قبل از وقت کی ملاقات کی نسبت لکھا ہے کہ "بعد از انقضائے سنوات موعود و مرور شہور و ایام معہود"۔ لیکن حساب کے لحاظ سے یہ بیان بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔

زندہ رہا کیونکہ مورخین لکھتے ہیں کہ باپ بیٹے چند مہینے ایک ساتھ رہے اور باپ نے اپنے ولی عہد سلطنت کو بہت سے امور سلطنت سکھائے۔ مورخ کے الفاظ ہیں :۔

(۱) "چند ماہے از تاثیر قران نیرین آسمان سلطنت وشہر یاری شادمانی در عالمیان عام و خوشحالی کہ جنس نایاب است فراواں گردید"[1]

(۲) ہمگی اوقات بترتیب شاہزادۂ ہوشمند دانا دل پرداختہ در تعلیم قواعد جہانداری و معدلت و آداب گیتی آرائی، ونصفت وقانون مجلس، ودیوان داری، ومراسم پادشاہی وشہر یاری، و اہتمام عساکر، ورعایت رعایا، و مرحمت برسائر خلائق وکافۂ برایا، عمر عزیز را صرف می نمودند۔ وہمیشہ گوش ہوش شاہزادۂ عالمیان را بہ دُرر نصایح، ولالی مواعظ، مشتمل بر آداب سلطنت ورسوم خلافت بود مزین ساختند۔ وخزانۂ حافظہ اش را از جواہر ولالی تواریخ واخبار وسیر سلاطین، ووقائع روزگار، وتجارب خواقین عالی مقدار ازمنہ واعصار، کہ ہر ایک بوقت خود در کار است مملو ومشمول می داشتند۔ وچند ماہے بایں نوع می گذرانیدند"[2]۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ سلطان محمد ۱۳ جمادی الاول کو انتقال کر گیا تو اس سے چند ماہ پیشتر ماہ ربیع الاول ہی کا مہینہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بادشاہ نے ملاقات کے لئے

"روز مبارک وساعت مسعود اختیار فرمودہ"[3]

اور ربیع الاول کی ۱۲ یا ۱۱، اس سے بہتر کونسا مبارک و مسعود دن ہو سکتا تھا۔

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۱۶ ۔ [2] حدیقۃ السلاطین ص ۱۷ ۔ [3] دیکھو صفحہ ۱۴

یہ ملاقات ربیع الاوّل سے پہلے ممکن نہ تھی کیونکہ شہزادہ نے ذیقعدہ یا ذی حجہ ۱۰۳۴ھ میں (یعنے بارھویں سال میں قدم رکھنے کے بعد) خواب دیکھا تھا اور اپنے بوڑھے استاد کو سنایا تھا جس کے کچھ ماہ بعد یہ استاد فوت ہوا۔ کیونکہ لکھا ہے :۔

"وچوں چندماہے برایں بگذشت مولوی کہ نہایت سن را دریافتہ وضعف شیخوخیت کمال قوت بہم رسانیدہ بود مزاجش کاستہ وگداختہ بیش ازیں درساحت حیات وفضائے کائنات استقامت واستدامت نتوانست نمود برفراش ناتوانی متقاعد گردیدہ، عزم ارتحال ازایں دارپرملال جزم نمود۔ بالضرورۃ وداع ملازمان وبندگان شاہزادۂ دوراں وقطع تعلقات ازحیات جسم وجاں فرمودہ بہ بیت السرور جاوداں رواں گردید"[1]

اس طرح مولٰنا حسین شیرازی کی وفات (۱۰۳۵ھ کے) صفر کے مہینے میں کسی تاریخ قرار پاتی ہے۔ یعنے میر محمد مومن کے نو ماہ بعد اور سلطان محمد قطب شاہ سے تین ماہ قبل حسین شیرازی نے وفات پائی۔ ان کی وفات کا عبداللہ قطب شاہ پر جو اثر ہوا اور اس کے دل میں اپنے اس بوڑھے استاد کی جو وقعت تھی اس کا اندازہ مورخ کے ان مندرجہ بالا الفاظ سے ہوسکتا ہے جو اس نے حسین شیرازی کی وفات کے متعلق استعمال کئے ہیں۔

سیدآباد کی مسجد کی وضع قطع

سید آباد کی مسجد کے کتبے اور اس کے کاتب کا حال بیان کرنے کے بعد اس کی وضع قطع سے متعلق بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ یہ کوئی بڑی مسجد نہیں ہے اور نہ اس کے منارہی بلند ہیں جیسا کہ اس کی تصویر سے ظاہر ہوگا۔ تاہم اسکی تعمیر میں تناسب اور نفاست کا

---

[1] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۳۔

خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کی تینوں کمانیں خوش وضع ہیں اور چھجے کے اوپر جو منڈیر بنائی گئی ہے اس پر پہلے اکیس ۲۱ چھوٹی چھوٹی کمانیں اور پھر علموں کی شکل کا حاشیہ دے کر عمارت کی روکار میں دیدہ زیبی پیدا کی گئی ہے۔

درمیانی کمان کے آگے تھوڑے فاصلہ پر ایک لمبوترا حوض بنایا گیا تھا جس میں اب مٹی بھری ہوی ہے اور اسی پر سے گذر کر اس وقت دروازہ سے مسجد تک پہنچتے ہیں۔ مسجد کے چبوترے کے اطراف دیوار کھینچدی گئی ہے۔ لیکن یہ دیوار بعد کی ہے۔ اصل میں میر صاحب نے مسجد کے اطراف سرائے بنائی تھی۔ اور اس سرائے کے عین وسط میں ایک اونچے چبوترے پر مسجد قائم کی گئی تھی۔ سرائے کا عقبی حصّہ تو اب بھی باقی ہے۔ لیکن سامنے اور دونوں پہلوؤں کی عمارت بعد کو منہدم ہوگئی۔ اور اس جگہ مختلف چھوٹے چھوٹے بے ترتیب مکان بن گئے ہیں۔ اور انہی مکانوں کی وجہ سے مسجد کے چبوترے پر حصار کی دیوار اٹھادی گئی ہے۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی مسجد کا اصلی صحن ہے۔ حالانکہ یہ درمیانی چبوترہ تھا۔ مسجد کا اصلی صحن چبوترے کے نیچے دور تک ہوگا اور مسجد اور سرائے کا باب الداخلہ اس مقام پر ہوگا جہاں اب ایک جاگیردار صاحب کا نئی وضع کا بنگلہ بن گیا ہے۔

مسجد کا مسقف حصہ دس گز طویل اور ۷ گز عریض ہے۔ درمیانی محراب میں سنگ موسیٰ کا عالی شان کتبہ ہے جس کے حروف پر طلائی کام کیا گیا تھا لیکن مرور ایام اور آب پاشی کی وجہ سے اب یہ باقی نہیں ہے البتہ لفظوں پر جگہ جگہ سنہرا رنگ اب بھی جھلکتا ہے۔

یہ مسجد اور سرائے ۱۱۸۰ھ تک ملا نیمی کی اولاد کے قبضہ میں رہی۔ اُس وقت سیّد حسین ولد سید جلال داماد سید محمد بن سیدلار محمد بن شاہ محمد بن ملا نیمی اس پر اور اس سے متعلقہ معاش پر قابض تھے۔

اور اُن کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اُن سے قبل ان کے مذکورۂ صدر اجداد جن کے نام انھوں نے اپنی ولدیت کے سلسلہ میں لکھے ہیں اس مسجد کی خدمت بجالاتے رہے اور اس سے متعلقہ معاش پر قابض تھے۔ جب مذکورہ سنہ میں حضرت میر محمد مومن کے ورثاء نے اس مسجد اور سرائے کو اپنے قبضہ میں کرلینا چاہا تو سید حسین نے اپنے قدیمی حقوق پیش کئے اور خدمت گذاری کا وعدہ کیا جس کی بنا پر میر مومن صاحب کے نبیرہ میر سید محمد کے فرزندوں (میر محمد حسین اور میر کاظم علی) نے اس معاش پر سید حسین ولد سید جلال کا قبضہ اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ وہ سال بسال ماہ شعبان میں پانچ روپیہ ماہانہ میر صاحبؒ کے فاتحہ اور چراغاں کے لئے دیا کریں۔ چنانچہ سید حسین نے اپنے اقرار نامہ میں لکھا ہے کہ:—

"آنہا (یعنے ورثائے میر صاحب) نظر بر قدامت من و شرط خدمت مسجد نمودہ مبلغ پنج روپیہ برائے چراغانِ عرس دائرہ میر محمد مومن صاحب مغفور از من قبول کنانیدہ از تقاضا دست برداشتند۔ و خودہم بہ رضا و رغبت خود راضی شدم کہ سال بہ سال در ماہ شعبان پنج روپیہ برائے چراغان عرس و فاتحہ سالیانہ می دادہ باشم۔ بعد من قائم مقام من سال بسال می دادہ باشد احیاناً کسے ازیں قرار برگردد یا تفاوت و یا تجاوز کند مجرم شرع شریف خواہد بود۔ و کان ذالک تحریراً فی التاریخ غرہ جمادی الاول ۱۱۸۵ھ ہجری۔"

لیکن میر صاحبؒ کے موجودہ وارث اور سجادہ مولوی میر عباس علی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ موعودہ رقم نہ اس وقت داخل ہوتی ہے اور نہ شاید ان کے والد میر حیدر علی مرحوم کے زمانہ میں داخل کی جاتی تھی۔ خود مسجد کی خدمت کے لئے بھی اب محکمۂ امور مذہبی کی طرف سے ایک موذن ملازم ہے جس کا بیان ہے کہ وہ تیس چالیس سال سے یہ کام انجام دیتا ہے اور مسجد کا کوئی متولی وغیرہ نہیں ہے اور نہ یہ معلوم کہ سید حسین ولد

سید جلال کی کوئی اولاد بھی اب باقی ہے یا نہیں۔ بہرحال مسجد تو آباد ہے اور اب تک اس میں پنج وقتہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ موزن کا بیان ہے کہ چالیس پچاس سال قبل مسجد ہی میں ایام عاشورہ میں علم بٹھائے جاتے تھے لیکن اب عرصہ سے یہ طریقہ مسدود ہے اور خود علم بھی شاید بلدہ حیدرآباد کے کسی صاحب کے یہاں ہیں۔

عاشور خانہ یہ امر یقینی ہے کہ سید آباد میں میر صاحب نے مسجد کے ساتھ عاشور خانہ بھی بنایا ہوگا۔ لیکن اس کی عمارت اب ناپید ہے اور شاید اسی عاشور خانہ کے علم بعد کو مسجد میں استاد کئے جاتے تھے۔ اس سال یعنی ۱۳۶۰ھ کے محرم میں مولف کتاب ہذا اور پروفیسر سید محمد صاحب نے دوبار سید آباد (موجودہ سیدا باغ) کی بستی کا معائنہ کیا تو وہاں صرف ایک مکان کے دیوان خانہ میں علم نظر آئے جو بالکل جدید ہیں اور یہ عاشور خانہ بھی حال ہی میں کسی خاتون کا بنایا ہوا ہے۔

سید آباد کی سرائے مسجد کے بعد میر صاحب کی سرائے کا بھی کچھ تذکرہ ضروری ہے۔ یہ سرائے کسی زمانہ میں بڑی آباد ہوگی۔ کیونکہ یہ شاہی راستہ پر واقع تھی۔ اب بھی اس کے کچھ بچے کھچے کمرے غریبوں کے مکان بن گئے ہیں اور اس طرح سے یہ سرائے آباد ہے۔

مسجد کے عقبی حصے کی طرف اس سرائے کی پوری کمانیں اب تک محفوظ ہیں ان کی تعداد سترہ ہے جن میں سے محراب کے عین مقابل والی تین کمانیں چھوٹی ہیں اور باقی کی چودہ کمانیں ایک ہی وضع قطع اور وسعت کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرائے مسجد حیات بخشی بیگم (واقع حیات نگر) اور مسجد کاروان قدیم کی سراؤں کی طرح عالی شان بنائی گئی تھی۔ اس میں جملہ ۵۶ کمرے تھے۔ عقبی حصہ کو چھوڑ کر بقیہ تینوں پہلوؤں کے وسط میں دروازے تھے۔ اور ان دروازوں کی دونوں طرف

سات سات کمانیں بنائی گئی تھیں۔ اِس سرائے کے شمالی گوشہ کی تصویر جو مسجد کی چھت پر سے لی گئی ہے اس کتاب میں شریک ہے۔

سرائے کے عقبی حصّہ میں پتھر کی بڑی بڑی سلیں چھت سے باہر نکال کر جو خوبصورت چھجا بنایا گیا ہے اس کے اہتمام اور مضبوطی کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ سرائے کس عمدہ پیمانہ پر تیار کی گئی تھی۔

میر پیٹھ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرمان مورخہ سنہ ۱۰۵۰ھ میں میر صاحب کے دوسرے گاؤں کے ساتھ میر پیٹھ کا ذکر ان الفاظ میں درج ہے :-

"در مصطفےٰ آباد عرف میر پیٹھ دو قطعہ تالاب بستہ و باغ نارجیل درختان مثمرہ نشاندہ[1] (کذا) دو مسجد کلاں احداث فرمودہ"۔

متن کے علاوہ فرمان کے نیچے تلنگی عبارت سے قبل جہاں میر صاحب کی جاگیرات کی فہرست لکھی گئی ہے وہاں بھی "موضع مصطفےٰ آباد عرف میر پیٹھ" کا نام دوسرے نمبر پر درج ہے۔

اس شاہی فرمان کے علاوہ میر پیٹھ کا ذکر ایک سَو دس سال بعد کے ایک محضر میں ملتا ہے جو میر صاحب کے ورثاء سید محمد، شاہ بیگم، زہرا شاہ، فخر النساء بیگم اور خیر النساء وغیرہ نے سنہ ۱۱۶۰ھ میں لکھا ہے۔ اس میں میر پیٹھ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :-

"در موضع مصطفےٰ آباد عرف میر پیٹھ پرگنہ حویلی حیدر آباد آباد ساختہ دو مسجد کلاں احداث

---

[1] غالباً نشاندادہ ہوگا۔

فرمودہ و دو تالاب بستہ و چاہ ہا کندہ باغ نارجیل و اشجار مثمرہ جمیع اقسام کاشتہ"[1]

اِن حوالوں کی بنا پر راقم الحروف نے شہر حیدرآباد کے اطراف و اکناف کے دیہات کی فہرستوں میں تلاش کرنا شروع کیا تو حسن اتفاق سے دو مختلف جگہوں پر میر پیٹھ نام کے دو دیہات کا پتہ چلا۔ جن میں سے ایک ضلع میدک کے متعلقہ باغات میں واقع ہے اور اب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی جاگیر ہے۔ اس میں ۲۴۲ مکانات ہیں جن میں جملہ ۲۰۰، نفوس (۳۴۹ مرد اور ۳۵۳ عورتیں) آباد ہیں[2]۔

دوسرا میر پیٹھ ضلع اطراف بلدہ کے شمالی تعلقہ میں نواب قدیر جنگ بہادر کی جاگیر ہے اس میں کل ۳۱ مکان ہیں جن میں ۱۲۶ نفوس (۶۴ مرد اور ۶۲ عورتیں) بستے ہیں[3]۔

ان معلومات کے بعد مصنف کتاب نے ان دونوں مقامات تک پہنچنے کے راستے اور دیگر حالات کی تلاش کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں تین دفعہ تاریخی معائنہ کے انتظامات کئے گئے۔

پہلی بار ۲ ؍ فروری ۱۹۴۱ء کو مولوی سید محمد صاحب ایم اے کی رہبری میں راستہ دیکھنے اور تیقین کے لئے کہ یہ میر مومن ہی کا بنایا ہوا میر پیٹھ ہے ظل اللہ گوڑہ اور میر پیٹھ کا سفر کیا گیا۔ اور جب تالاب، مسجد اور کتبہ وغیرہ دیکھنے کے بعد یقین ہوگیا کہ یہ میر محمد مومن ہی کا بنایا ہوا گاؤں اور مسجد ہے تو ۵ ؍ فروری کو ادارہ کی طرف سے تاریخی معائنہ کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ پروفیسر محمد صدیقی،

---

[1] اصل محضر کی آئندہ صفحات میں نقل درج ہے۔

[2] دیکھو فہرست دیہات ضلع میدک (انگریزی) مطبوعہ دفتر اعداد و شمار حیدرآباد بابت ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۰ ۔

[3] دیکھو فہرست دیہات ضلع اطراف بلدہ (انگریزی) مطبوعہ " " " صفحہ ۱۱ ۔

پروفیسر سید محمد، مولوی عبدالرحمٰن شریف، مولوی صدیق علی ماہر چربہ اور بھگوان صاحب فوٹوگرافر کی معیت میں اس روز کئی گھنٹے میر پیٹھ میں گذرے۔ اور مسجد کی تصویریں اور کتبوں کے چربے لیے گئے میر پیٹھ کے دونوں معائنوں میں مولوی عبدالرشید صاحب بی۔اے نے (جو حسن اتفاق سے اسی باغ میں رہتے ہیں جو میر صاحبؒ کا لگایا ہوا ہے) بڑی زحمت اٹھاکر ہماری معلومات میں اضافہ کا انتظام کیا، اور ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ چنانچہ مسجد کو درختوں وغیرہ سے صاف کیا، دھلوایا، کتبوں میں سے چونا اور گرد وغبار نکلوایا اور ہماری پُرتکلف ضیافت بھی کی۔

یہ میر پیٹھ شہر حیدرآباد سے تقریباً ۸ میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق کی سمت میں واقع ہے۔ اور اس کا راستہ چمپا پیٹھ، کرمن گھٹ، اور ظل اللہ گوڑہ پر سے گزرتا ہے۔ لیکن چمپا پیٹھ کے بعد سے کچی سڑک ہے جس پر سے موٹر قدرے زحمت کے ساتھ میر پیٹھ تک پہنچتی ہے۔

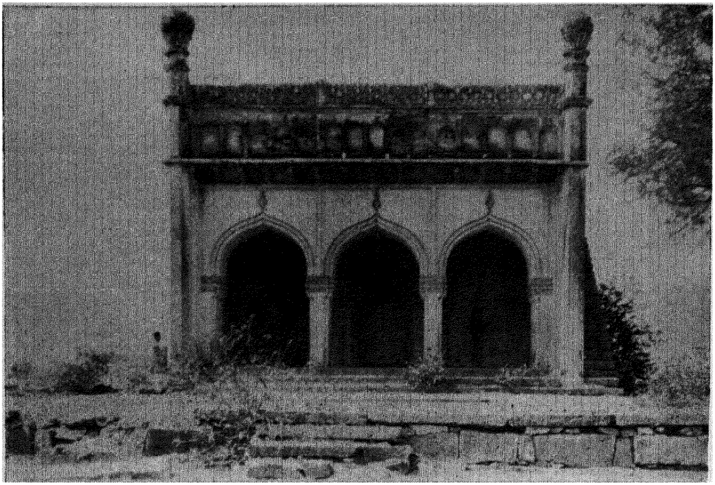
ظل اللہ گوڑہ

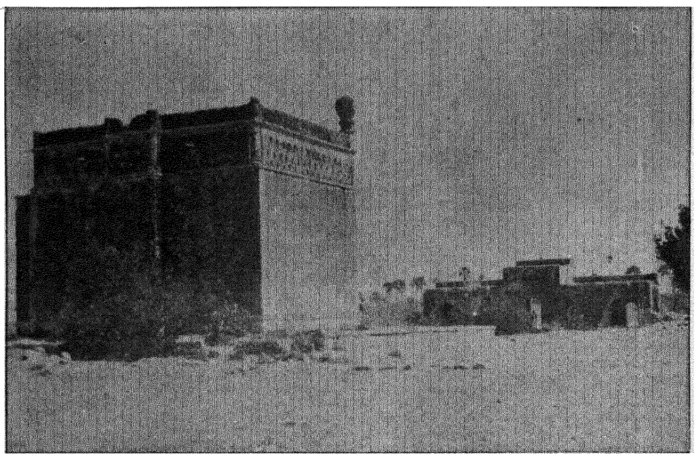
ظل اللہ گوڑہ بھی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو اب عام طور پر جلد اللہ گوڑہ کہلاتا ہے لیکن اصل میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے سلطان محمد قطب شاہ کے لقب ظل اللہ سے منسوب ہے۔ اور یہ گاؤں بھی میر صاحبؒ ہی کی تحریک پر میر پیٹھ کے ساتھ عہد محمد قلی ہی میں بسایا گیا ہوگا۔ کیونکہ بادشاہ اپنے بھتیجے کو بچپن سے ظل اللہ پکارا کرتا تھا اور چونکہ یہ شہزادہ میر مومن کا خاص منظور نظر تھا اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ میر صاحبؒ نے اپنے گاؤں کے قریب اس شہزادے کے نام سے بھی اسی وقت ایک دوسرا گاؤں بھی بسایا ہو۔ چنانچہ انھوں نے میر پیٹھ میں جو بڑی مسجد بنائی ہے وہ ظل اللہ گوڑہ اور میر پیٹھ دونوں کے درمیان واقع ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں گاؤں ایک ساتھ آباد کئے گئے تھے اور دونوں کے لئے ایک ہی مسجد بنائی گئی تھی۔

ظل اللہ گوڑہ کا مندر

ظل اللہ گوڑہ میں ایک بہت بڑا مندر بھی ہے جس کی جاترا ہر سال بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس جاترا میں شرکت کے لئے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کی رانی صاحبہ یہاں آیا کرتیں اور اسی باغ میں کئی روز رہتیں جو میر صاحب کا لگایا ہوا ہے اور جو اب مولوی عبدالرشید صاحب کا مملوکہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی آمدورفت اور قیام کے پیش نظر بعد کو مہاراجہ بہادر نے اپنے عہد دیوانی میں موضع کرمن گھٹ کا عالیشان بنگلہ بنایا تھا۔ لیکن اس کے بنتے ہی ان کو مدارالمہامی سے ہٹنا پڑا اور انھوں نے اس مکان کو منحوس سمجھ کر اس میں کبھی قیام نہیں کیا۔

اس مندر کی عالیشان عمارت اور رتھ اور اس کے وسیع و بلند حصار کو دیکھ کر اس محضر کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ میر صاحب کے دیہات کو مادھو زنار دار نے اپنے بت خانہ سے متعلق کر دیا تھا۔ اور جس کی اصل عبارت اسی کتاب کے صفحہ ۶۸ پر نقل کی گئی ہے۔ اس مندر کے دیکھنے سے قبل مذکورہ محضر کی نسبت یہ خیال کر لینے میں کوئی امر مانع نہ تھا کہ شاید میر صاحب کے ورثا نے مغل فاتحین کی اس تبلیغ و تشہیر سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے قطب شاہی سلطنت کو اس لئے فتح کیا تھا کہ اس میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سلطنت کے خاتمہ کے بعد اس کے اکثر وبیشتر جاگیرداروں اور انعامداروں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور لازمی طور پر میر محمد مومن کی جاگیرات بھی مغلیہ عملداری کے بعد ان کی اولاد کے قبضہ و تصرف میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ جس وقت یہ محضر لکھا گیا تھا گولکنڈہ کی سلطنت کے زوال کو باسٹھ سال گذر چکے تھے۔ اور اس اثنا میں حیدرآباد میں کئی صوبہ داروں کا عمل دخل رہا۔ اس طرح اگرا اورنگ زیب نے میر صاحبؒ کی





میر محمد مومن کی مسجد واقع میر پیٹھ کا اگلا اور پچھلا رخ

جاگیرات ضبط نہ کی ہوتیں تو اس طویل مدّت میں کسی نہ کسی کے ہاتھوں ضرور یہ بات ظہور میں آتی۔ ایسی صورت میں جاگیرات کی بحالی کے لئے درخواست دیتے وقت یہ لکھنا قرین مصلحت تو نہ تھا کہ یہ جاگیریں اورنگ زیب بادشاہ یا ان کے صوبہ داروں نے چھین لی ہیں۔

میر پیٹھ کی مسجد

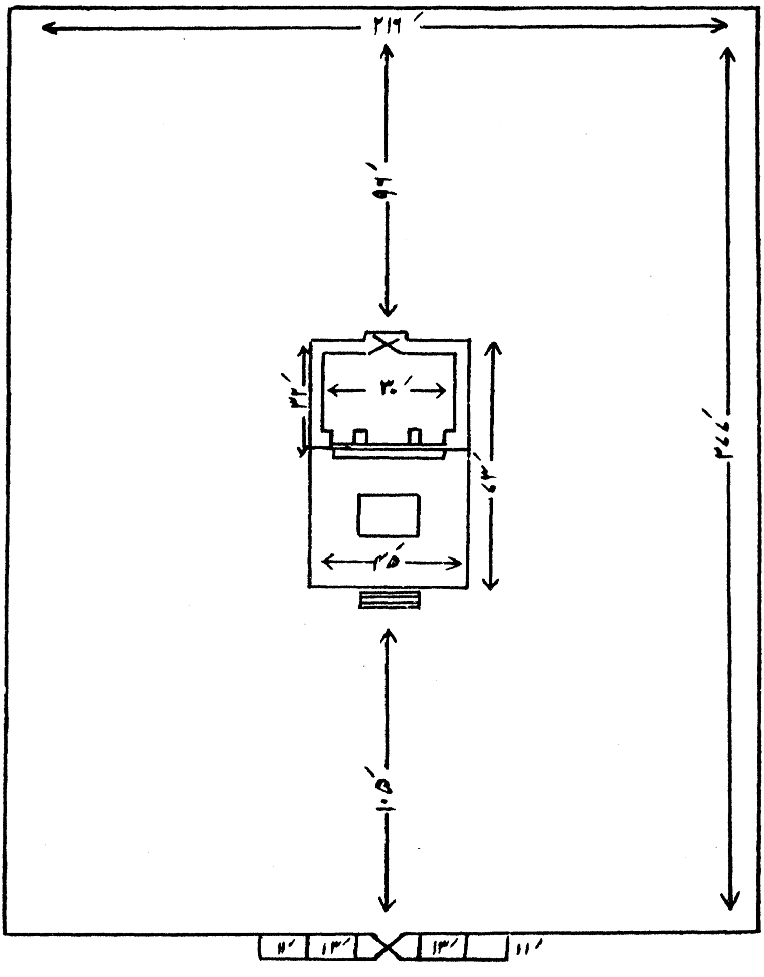
ظل اللہ گوڑہ اور میر پیٹھ کے درمیان میر محمد مومن نے جو مسجد بنائی تھی اس کی وضع قطع قریب قریب وہی ہے جو سید آباد کی مسجد کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موخرالذکر مسجد کے اطراف سرائے بنائی گئی تھی اور میر پیٹھ کی مسجد کے اطراف ایک وسیع صحن چھوڑ کر احاطہ کی پختہ دیوار بنا دی گئی ہے۔ اور مسجد کے عین مقابل ایک عالی شان باب الداخلہ بنایا گیا ہے جس کے دونوں طرف دو دو وسیع کمان دار کمرے ہیں جو اب تک شکستہ حالت میں موجود ہیں اور جب کبھی شہر حیدرآباد میں طاعون آتا ہے تو متعدد خاندان ان کمروں میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ اصل میں ایک چھوٹی سی سرائے کے طور پر بنائے گئے تھے اور اب بھی گویا اسی کام میں لائے جاتے ہیں۔

مسجد کے وسیع احاطہ میں ایک باغ لگایا گیا تھا جس کی روشوں کے آثار آج تک موجود ہیں۔ اس احاطہ میں جانب جنوب دیوار سے متصل ایک قبر ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ دورانِ تعمیر میں مسجد پر سے کوئی مزدور گر گیا تھا جس کو اسی احاطہ میں دفن کر دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک مسجد کے اندر ایک بہت بڑی باولی تھی۔ لیکن اب اس کا پتہ نہیں۔ باغ کی ضرورت کے لحاظ سے باولی کا وجود یقینی ہوگا۔ البتہ باب الداخلہ سے قریب جانب شمال ایک چھوٹی سی باولی اب بھی موجود ہے۔ یہ غالباً غیر مسلم لوگوں یا راہگیروں کے لئے بنائی گئی تھی۔

میر بیٹھ کی مسجد کا نقشہ

نوٹ۔ یہ خاکہ مولوی عبدالرشید صاحب صابی نے اپنی مہربانی سے پیمائش وغیرہ کی زحمت اٹھا کر تیار کیا ہے۔ ایک انچ برابر ہے ۵۰ فٹ کے



میر پیٹھ کی مسجد کی وضع قطع

میر پیٹھ کی مسجد سید آباد کی مسجد سے پانچ چھ سال بعد یعنے ۱۰۱۹ھ و ۱۰۲۰ھ میں بنائی گئی ہے۔ اس لئے لازمی طور پر اس میں بعض چیزوں میں اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً مسجد کے روکار میں کمانوں اور منڈیر کی خوبصورتی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اور رواق کے اوپر کتبہ میں بھی اضافہ ہے۔

سید آباد کی مسجد میں ہر کمان کے اوپر منڈیر میں سات سات چھوٹی کمانیں بنائی گئی ہیں۔ لیکن میر پیٹھ کی مسجد کی کمانوں پر پانچ پانچ اس طرح جملہ پندرہ کمانیں ہیں۔ اسی طرح کمانوں کے اوپر علموں کی وضع کا جو نقش و نگار بنایا گیا ہے اس میں بھی تبدیلی کی گئی ہے۔ سید آباد کی مسجد میں کمانوں یا طاقچوں کی مناسبت سے چھوٹے چھوٹے علم بنائے گئے ہیں اور میر پیٹھ کی مسجد میں یہ کافی چوڑے اور بڑے ہیں۔ ان سب کی وضاحت مسجدوں کی ان تصویروں سے ہوسکتی ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

مسجد میر پیٹھ کا کتبہ

جیسا کہ ابھی کہا گیا اس مسجد اور سید آباد کی مسجد کے کتبہ میں تھوڑا سا فرق ہے۔

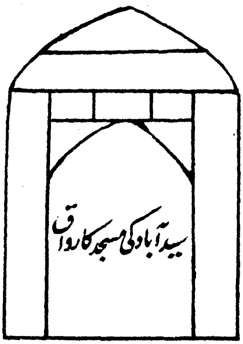
سب سے پہلا اور نمایاں فرق یہ ہے کہ سید آباد کی مسجد میں محراب کے دونوں طرف کے گوشوں کو بالکل سادہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف میر پیٹھ کی مسجد میں ان پر حلقے بنا کر دائیں طرف لکھا ہے۔

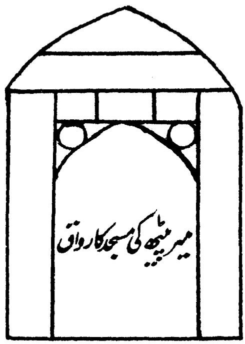
قال محمد نبی الکونین

اور بائیں طرف کے گوشہ میں

المومن حی فی الدارین ۱۰۱۹ھ

درج ہے۔ ذیل کے نقشوں سے واضح ہوگا کہ ان گوشوں سے کیا مراد ہے۔

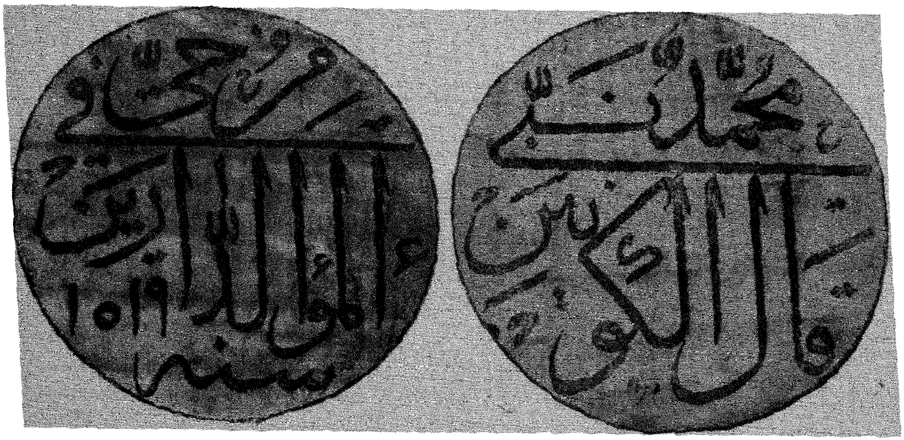




اس طرح پہلی کمان کے دونوں گوشے سید آباد کی مسجد میں خالی چھوڑ دئے گئے تھے اور بعد کو میر پیٹھ کے کتبے میں اس خالی جگہ کو پر کر لینے کے لئے ایک ایسی اچھی حدیث کا انتخاب کر لیا گیا جس میں خود بخود بانیٔ مسجد محمد مومن کا نام بھی بطور سجع نکل آتا ہے یعنے دائیں حلقے میں محمد نمایاں ہے اور بائیں میں مومن۔

کتبے میں دوسرا فرق محراب کے عین اوپر کی یعنی درمیانی تختی میں بجائے ربنا وتقبل منا بآله النبی کے وربنا وتقبل منا بآله النبی کندہ کرایا ہے۔ یعنے ایک حرف واؤ کا اضافہ کر دیا گیا جس کی وجہ سے بجائے ۱۰۱۴ھ کے سنہ ۱۰۲۰ھ تاریخ مسجد نکل آتی ہے۔

سید آباد اور میر پیٹھ کی مسجدوں کے کتبوں کا تیسرا فرق محراب کی دائیں طرف درود کے آخری حصہ میں ہے۔ یعنے سید آباد کی مسجد میں صرف خلیفۃ الرحمن الانس والجان لکھا ہے اور



میر محمد مومن کی بنائی ہوئی مسجدوں کے محرابوں کے گوشوں میں جو کتبے درج ہیں ان کے عکس - ان میں
میر صاحب کا نام اور بنائے مسجد کی تاریخ بھی ہے -

اور میر پیٹھ کی مسجد میں خلیفۃ الرحمان سید الانس والجان۔

اسی طرح درود کے ختم پر سید آباد کی مسجد میں الی یوم الدین ہے اور میر پیٹھ کی مسجد میں نہیں ہے۔ اس کی جگہ کاتب نے اپنے نام میں اضافہ کیا ہے۔ یعنے

سید آباد کی مسجد میں لکھا ہے:۔ نمقہ عبدہ حسین شیرازی

میر پیٹھ کی مسجد میں لکھا ہے:۔ عبدہ حسین بن محمود الشیرازی ۱۰۲۰

میر پیٹھ قریب ظل اللہ گوڑہ

کوہ مولا علی کے جانب جنوب مشرق کوئی ایک میل کے فاصلہ پر میر صاحب کا ۱۰۱۹ھ میں بسایا ہوا ایک اور گاؤں میر پیٹھ اب بھی موجود ہے۔
اس کا راستہ باغ ابن صاحب کی دیوار کے ساتھ ساتھ جاتا ہے اور باغ کے عقب میں پہنچنے کے بعد تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر پہلے میر صاحب کا بنایا ہوا تالاب اور پھر مسجد نظر آتی ہے۔ راستہ اچھا ہے۔ ظل اللہ گوڑہ کے قریب جو میر پیٹھ واقع ہے اس کے راستہ کی طرح موٹر نشینوں کے لئے تکلیف دہ نہیں ہے۔[1]

مسجد

اس میر پیٹھ میں بھی میر محمد مومن نے اپنے دوسرے دیہات کی طرح مسجد اور تالاب وغیرہ بنوائے تھے۔ مسجد کی وضع بالکل وہی ہے جو میر صاحب کی بنائی ہوئی دوسری مساجد واقع

---

[1] اس میر پیٹھ کا پتہ مولوی میر عباس علی صاحب مہتمم معلائی کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر سے اتفاقاً اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا۔ اگر وہ اس کی طرف توجہ نہ دلاتے تو راقم نہ وہاں پہنچ سکتا اور نہ اس کتاب میں اس کا بیان درج ہونے پاتا۔ راقم نے پروفیسر مجید صدیقی صاحب اور مولوی میر عباس علی صاحب کی معیت میں اسکا معائنہ ۱۲ فروری ۱۹۴۱ء کی صبح میں کیا۔

سیدآباد و میر پیٹھ وغیرہ کی ہے۔ یہ ایک ایسے وسطی مقام پر بنائی گئی تھی جس کے چاروں طرف چار گاؤں (یعنے میر پیٹھ' ملاپور' ینگنا کنٹہ' اور شکر اللہ گوڑہ) آباد ہیں۔ وہاں کے پٹیل شمس الدین کا بیان ہے کہ پہلے میر پیٹھ کی آبادی مسجد کے بالکل قریب ہی جانب جنوب واقع تھی۔ لیکن بعد کو چوریوں اور ڈاکوں کی وجہ سے پوری آبادی جنوب کی طرف ذرا دور منتقل ہوگئی اور یہ مسجد اب آبادی سے کافی فاصلہ پر واقع ہے اور بالکل ویران و بے چراغ پڑی ہوی ہے۔ اگر اب بھی اس کو محفوظ نہ کر لیا جائے تو اندیشہ ہے کہ کوہ شریف کے قریب میر محمد مومن کے یہ آثار باقی نہ رہیں گے۔

یہ مسجد اور میر پیٹھ کی بستی اب نواب قدیر جنگ کی جاگیر ہے۔ اس کی آبادی صرف ۱۲۶ نفوس پر مشتمل ہے جن میں ۶۴ مرد اور ۶۲ عورتیں ہیں[۱]۔

تالاب میر پیٹھ کا تالاب میر صاحب کے دوسرے دیہات کے تالابوں کے مقابلہ میں مسجد سے قریب تر واقع ہے۔ لیکن یہ اب بالکل خشک ہوگیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دس بارہ سال سے اس میں پانی نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے پانی کی سوتیں بند ہوگئی ہیں۔ لیکن تالاب کا سنگ بستہ اونچا بند مسجد کی جانب شمال مشرق اب تک محفوظ ہے۔ یہاں سے اور میر صاحب کی مسجد کی چھت اور صحن میں سے بھی کوہ شریف کا منظر بڑا سہانا نظر آتا ہے۔

---

[۱] دیکھو فہرست دیہات ضلع اطراف بلدہ (انگریزی) مطبوعہ دفتر اعداد و شمار حیدرآباد بابت ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۱۔

میر صاحب کا کتبہ اس مسجد کا کتبہ بھی مولنا حسین شیرازی کا لکھا ہوا ہے۔اور اُس کتبہ کی بعینہ نقل ہے جو ظل اللہ گوڑہ کے متصل میر پیٹھ کی مسجد میں لگا ہوا ہے۔لیکن یہ اب اپنی اصلی جگہ پر نہیں ہے بلکہ محراب کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے مسجد کی چھت پر رکھ دیا گیا تھا۔اور وہاں سے کسانوں اور دھنگروں کے شریر لڑکوں نے اس کو توڑ توڑ کر مسجد کے اطراف دور دور تک پھینک دیا ہے۔چنانچہ ہم نے ایک مزدور کے ذریعہ سے اس کے مختلف ٹکڑے پھر مسجد کی چھت پر جمع کئے[1]۔جس کی وجہ سے ایک حد تک مکمل کتبہ پڑھ لیا جا سکا۔اس میں اور سابق الذکر میر پیٹھ کی مسجد کے کتبہ میں صرف ایک جگہ فرق نظر آیا اور وہ یہ کہ پہلے کتبہ میں المومن حی فی الدارین کے نیچے صرف سنہ ۱۰۱۹ھ لکھا گیا ہے اور اس کتبہ میں لکھا ہے۔

المومن حی فی الدارین تاریخ بناءِ مسجد سنہ ۱۰۱۹ھ

اس کتبہ کا ذکر مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی نے مآثر دکن میں صفحات ۱۹ و ۲۰ پر درج کیا ہے۔لیکن انھوں نے اس مسجد کو مسجد شکر اللہ گوڑہ کے نام سے یاد کیا ہے۔اور ساتھ ہی نیچے یہ بھی لکھدیا ہے کہ

---

[1] ہم نے شمس الدین پٹیل سے کہا ہے کہ سیڑھیوں کا راستہ دیوار اٹھا کر بند کر دیا جائے تاکہ پھر کوئی اوپر چڑھ کر ان پتھروں کو منتشر نہ کر سکے۔اس کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر نے فرمایا ہے کہ اس مجروح کتبے کو سمنٹ سے اپنی جگہ پر پھر سے لگوا دیا جائے گا۔

"واقع امیر[1] پیٹھ سواد کوہ مولاعلی"

اس کے بعد کتبہ نقل کیا ہے اور اس کی نسبت یہ رائے ظاہر کی ہے :۔

"کتبہ اکثر مقامات سے ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس کے کئی ٹکڑے مفقود ہوگئے ہیں۔

ز۔ مسجد مرمت طلب ہے۔

ح۔ کتبہ قابل تحفظ ہے۔

ط۔ سواد کوہ شریف میں ابن صاحب کے باغ کے عقب میں ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر موضع شکر اللہ گوڑہ کے قریب ایک غیر آباد مسجد واقع ہے جو وسیع احاطہ میں ایک بلند چبوترہ پر بنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتبہ صحن مسجد کے رواق میں نصب تھا۔ لیکن رواق ٹوٹ جانے کے بعد اس کو بعض اصحاب نے بہ نظر حفاظت مسجد کی چھت پر رکھوا دیا۔ کتبہ کا طول تین گز اور عرض دو گز محراب دار وضع کا ہے۔ اور خط نہایت پاکیزہ ثلث ہے۔ اس کے سنہ تعمیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد سلطان محمد قلی قطب شاہ کی وفات سے ایک سال قبل اور جامع مسجد کی تعمیر سے ۱۳ سال بعد بنی تھی۔ مسجد اگرچہ مختصر ہے لیکن کتبہ کی شان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی اہتمام سے بنوائی گئی تھی۔ اور ممکن ہے کہ کوہ شریف کی زیارت کو بادشاہ کی آمد کے مواقع پر اس حصۂ زمین پر کیمپ شاہی ہوتا ہو۔

---

[1] تعجب ہے کہ مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی نے اس کا نام امیر پیٹھ لکھا ہے حالانکہ فہرست دیہات ضلع اطراف بلدہ میں اسکا نام میر پیٹھ درج ہے اور شمس الدین بیل سے بھی یہی معلوم ہوا کہ عوام میں میر پیٹھ مشہور ہے۔

اس لئے کہ اس مسجد کے قرب وجوار میں کوئی مقبرہ یا اور کسی قدیم آبادی کے آثار ایسے موجود نہیں ہیں جس سے اس مسجد کا تعلق ظاہر ہو۔[1]

غرض آج سے تقریباً اٹھارہ سال قبل مولوی سید علی اصغر صاحب کو اس واقعہ کا علم نہ ہوسکا تھا کہ یہ مسجد میر پیٹھ سے متعلق تھی اور اس کے بانی حضرت میر محمد مومن تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے یہ مسجد، تالاب اور گاؤں محض کوہِ شریف کی قربت کی وجہ سے اور عرس وغیرہ کے زمانہ میں قیام کے لئے بنوایا تھا۔

اس مسجد کے تذکرہ کو ختم کرنے سے قبل اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ چھت پر جانے کے لئے اس میں جو سیڑھیاں بنائی گئی ہیں وہ مسجد کی شمالی دیوار کے اندر ہی بنائی گئی ہیں اس کے برخلاف سید آباد واقع سابق الذکر میر پیٹھ کی سیڑھیاں شمالی دیوار سے ملحق باہر کی طرف نکلی ہوئی ہیں نہ ان پر چھت ہے اور نہ وہ یہاں کی سیڑھیوں کی طرح محفوظ ہیں۔

اُپّل سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرمان کے آخر میں میر صاحب کی جن جاگیروں کے نام لکھے ہیں ان میں پانچویں نمبر پر "موضع اوپل حویلی حیدرآباد" کا نام بھی درج ہے۔ یہ موضع اس شاہراہ پر واقع ہے جو شہر حیدرآباد سے عنبر پیٹھ ہوتی ہوئی بھونگیر کو جاتی ہے۔ شہر سے اس کا فاصلہ آٹھ نو میل ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی جدید عمارتیں اسی موضع کے جانب شمال مشرق بن رہی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے مستقبل قریب میں اس مقام کی آبادی اور اہمیت میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔

---

[1] دیکھو مآثر دکن صفحات ۱۹ و ۲۰۔

مسجد اپل کے معائنہ سے پتہ چلا کہ وہاں میر مومن صاحب کے کوئی آثار اس وقت محفوظ نہیں ہیں۔ ایک عالی شان سنگ بستہ مسجد سر راہ واقع ہے جس کے منار بہت بلند ہیں اور جو صاف تراشیدہ پتھروں سے اونچی جگہ پر خاص اہتمام کے ساتھ بنائی گئی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس تزک واحتشام کے باوجود اس میں کوئی کتبہ موجود نہیں۔ لیکن طرز تعمیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سلطان محمد کے آخری دور یا عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بنائی گئی ہوگی۔ کیونکہ محمد قلی کی بیشتر عمارتوں کے روکا گچ اور چونے سے تیار کئے گئے تھے اور حیدرآباد میں مصفا پتھر کی عمارتوں کا رواج عہد سلطان محمد قطب شاہ سے عام طور پر شروع ہوا تھا۔ چنانچہ مکہ مسجد، ٹولی مسجد اور حیات نگر کی مسجد وغیرہ جو صاف پتھر سے بنائی گئی ہیں عہد محمد قلی کے بعد کے آثار ہیں۔

اپل میں میر صاحب کی بنائی ہوئی مسجد نہ ملنے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ اصل میں الگ بسایا ہوا گاؤں نہیں تھا بلکہ یہ ان چھ دیہات میں سے ایک تھا جو سلطان محمد قطب شاہ نے میر صاحب کو بطور انعام و جاگیر عطا کئے تھے۔ اور جن کی نسبت عبداللہ قطب شاہ نے اپنے فرمان مورخہ ۲۲ جمادی الاول ۱۰۵۰ھ میں لکھا ہے :۔

"سوائے ملک و میراث تالاب ہائے ایشاں شش دیہات بدل انعام بنام میر معز الیہ و باولاد و احفاد او مرحمت کردہ دادہ بودند"

معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے انتقال کے چھ سال بعد عہد عبداللہ قطب شاہ میں ان کی دوسری جاگیرات کی طرح موضع اپل بھی کسی اور کے قبضہ میں چلا گیا اور اس واقعہ کے نو سال بعد تک یہ دوسروں ہی کے قبضہ و تصرف میں رہا اور اسی زمانہ میں (یعنی ۱۰۴۱ھ سے ۱۰۵۰ھ) کے درمیان وہ مسجد بنائی گئی

جس کا ذکر ابھی کیا گیا لیکن جب میر جعفر وغیرہ نبیرہائے میر مومن نے عریضہ پیش کر کے بادشاہ کو توجہ دلائی تو سلطان عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۵۰ھ میں حکم صادر کیا کہ میر مومن صاحب کی جاگیرات ان کے نبیروں کے نام غرہ جمادی الثانی ۱۰۴۱ھ ہی سے بحال سمجھی جائیں چنانچہ فرمان کے الفاظ ہیں :۔

"حکم عالی متعالی صادر گشتہ در سنہ تا لا بہا محصول باغ و دیہات وغیرہ از استقبال غرہ جمادی الثانی سنہ احدی و اربعین الف سال بسال در وجہ انعام باولاد و احفاد میر مرحوم الی ماتوالدو اوتناسل مرحمت فرمودیم و باز مواضع مذبور را در وجہ انعام نبیرہائے میر مذبور مجری دانستہ جاری و ممضی و مستمر دارند۔" وغیرہ۔

غرض اصل میں اگرچہ میر صاحب کے کوئی آثار اس وقت محفوظ نہیں ہیں لیکن اس کے لئے یہی شرف کیا کم ہے کہ وہ کسی زمانہ میں میر صاحب کی جاگیر رہ چکا تھا۔

راوریال عرف مومن پور

میر صاحب کے آباد کئے ہوئے دیہات میں سے ایک راوریال بھی ہے جس کا ذکر سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اپنے مذکورہ فرمان میں اس طرح کیا ہے :۔

"میر محمد مومن مبلغے خطیر مال خود خرچ کردہ در موضع راوریال عرف مومن پور پرگنہ مذکور یک تالاب بست۔"

اسی طرح ۱۱۶۰ھ کے اس محضر میں جو میر صاحب کی اولاد (یعنے سید محمد، شاہ بیگم، زہرا شاہ، فخر النسا اور خیر النسا وغیرہ) نے لکھا تھا اس گاؤں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے :۔

"در موضع مومن پور عرف راوریال پرگنۂ ابراہیم پٹن مبلغ کثیر از مال خود خرچ کردہ یک

تالاب بستہ :-

موضع راوریال کے پرگنہ ابراہیم پٹن میں واقع ہونے کا تذکرہ عبداللہ قطب شاہ کے مذکورہ فرمان میں بھی درج ہے۔ کیونکہ فرمان کے آخر میں اکثر دیہات کے نام کے ساتھ پرگنہ یا حویلی کا بھی اندراج کر دیا گیا ہے۔
اِن حوالوں کی بنا پر راقم الحروف نے میر بیٹھ کے پہلے سفر میں راوریال کی نسبت بھی معلومات دریافت کیں تو پتہ چلا کہ وہاں سے آٹھ دس میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں اِس نام کا موجود ہے۔ اِس بناء پر اس کے معائنہ کا تہیہ کیا گیا لیکن چار یا پانچ میل تک بیل گاڑی کا راستہ دقت سے طے کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ موٹر آگے نہیں بڑھ سکتی کیونکہ راستہ بالکل تنگ اور چٹانوں سے معمور تھا۔ چنانچہ ایک جگہ موٹر اس طرح پھنس گئی کہ بڑی دقت سے اس کو وہاں سے پیچھے ہٹانا پڑا۔ غرض اِس طرح ناکام واپسی کے بعد مولوی عبدالرشید صاحب نے مہربانی فرماکر خود کسی طرح راوریال جاکر معلومات حاصل کرنے کا ذمہ لیا۔ چنانچہ وہ دوسرے روز زحمت اٹھاکر وہاں پہنچے اور اس کی نسبت معلومات حاصل کرکے جو خط روانہ کیا اس کا اقتباس درج ذیل ہے:-

> "میں خود موٹر کا راستہ دیکھنے کے خیال سے راؤریال گیا تھا۔ یہ کنگرہ راوریال ہے۔ اس میں جو مسجد ہے وہ ننھے خاں اور رحمان صاحب کی بنائی ہوئی ہے۔ ایک بڑھیا مزدورنی بلوائی گئی اور پولس پٹیل نے اس کا بیان سنا کہ اس نے خود اس کی تعمیر کے وقت مزدوری کی ہے۔ یہ پچپن سال کی عمارت ہے۔ عاشور خانہ میں ایک پنجہ کچھ پرانا ہے۔ لیکن وہاں یہ معلوم ہوا کہ راؤریال دراصل قطب شاہی زمانہ بنڈہ راؤریال قریب حیات نگر ہے۔ یہ بھی تقریباً دس یا ۱۲ میل ہے" وغیرہ۔

بنڈہ راؤریال

ان معلومات کی بناپر ۵ فروری ۱۹۴۱ء کی صبح میں حیات نگر کا سفر کیا گیا لیکن وہاں کے باشندوں سے معلوم ہوا کہ بنڈہ راؤریال کا راستہ بہت خراب ہے اور وہاں موٹر نہیں جاسکتی۔ نیز وہاں کوئی مسجد بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس کے معائنہ کا خیال ترک کردینا پڑا۔ دیہات کی سرکاری فہرست دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس راؤریال میں ۲۳۰ مکان ہیں جن میں کل ۹۳۹ آدمی (۴۵۵ مرد اور ۴۸۴ عورتیں) بستے ہیں[۱]۔

کنگرہ راؤریال

میر مومن صاحب کا آباد کیا ہوا راؤریال اصل میں کنگرہ راؤریال ہی ہے کیونکہ میر پیٹھ، حیات نگر، اور راؤیل کے دیہاتی باشندوں سے تبادلۂ خیال میں پتہ چلا کہ راؤریال اور کنگرہ دو جدا جدا دیہات ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل راستہ کے دو طرف واقع ہیں۔ یعنے راستہ کی ایک طرف کی آبادی راؤریال کہلاتی ہے اور دوسری طرف کی کنگرہ جب میر صاحب نے راؤریال بسایا تو محمد قلی قطب شاہ نے اس کے مقابل کا گاؤں کنگرہ بھی میر صاحب کو بطور جاگیر عطا کردیا۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کے مذکورہ فرمان میں میر صاحب کی جاگیرات کی فہرست میں آخری نام "موضع کنگرہ حویلی حیدرآباد" درج ہے۔

اس راؤریال کو دیکھنے کی کوشش جاری رہی۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں مولوی مصلح الدین صاحب انصاری بی۔اے تحصیلدار ضلع باغات کو راقم نے توجہ دلائی تھی کہ اس کی نسبت اپنے علاقہ کے پٹیلوں اور پٹواریوں سے معلومات حاصل کریں انھوں نے اس کی نسبت لکھا کہ :-

---

[۱] دیکھو فہرست دیہات اطراف بلدہ (مطبوعہ انگریزی ۱۹۳۱ء) صفحہ ۳۔

"راؤریال کا تعلق علاقہ صرف خاص مبارک سے ہے اور یہ مقام پہاڑی شریف سے آگے
پانچ میل پر واقع ہے۔ اُپّیا گوڑہ جو پہاڑی شریف سے تین میل کے فاصلہ پر تعمیرات کی
سڑک پر واقع ہے وہاں سے دیہی راستہ ملتا ہے۔ جہاں سے موضع زیر بحث دو میل
رہ جاتا ہے۔"

فہرست دیہات اطراف بلدہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس راؤریال میں ۱۵۵ مکان ہیں جن میں ۸۱۳ نفوس (۴۰۲ مرد اور ۴۱۱ عورتیں) آباد ہیں[۱]۔

آخرکار ۹ / مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو راقم نے مولوی سید محمد تقی صاحب معتمد مجلس انتظامی دائرہ میر محمد مومن اور راجہ دین دیال (فوٹوگرافر) کی معیت میں اس راؤریال کا سفر کیا۔ اُپّیا گوڑہ سے جانب مشرق تھوڑی دور دیہی راستہ طے کرنے کے بعد راؤریال کے عظیم الشان تالاب کا بند اور توم نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ تالاب دکن کے بڑے تالابوں میں سے ہے اور ابراہیم پٹن کے تالاب سے بھی بڑا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ بھی اس وقت خشک نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ چند روز قبل تک اس میں پانی تھا اور دو چار ماہ قبل شہزادہ اعظم جاہ بہادر ولیعہد سلطنت آصفیہ نے اس تالاب میں بطوں کا شکار کیا۔

راؤریال کی بستی بہت اچھی ہے اور زیادہ تر مسلمان آباد ہیں اس میں ایک مسجد بھی ہے لیکن جیسا کہ مولوی عبدالرشید صاحب بی۔ اے نے لکھا تھا یہ مسجد بعد کی تعمیر معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ میر صاحب نے یہاں کوئی مسجد نہیں بنائی حالانکہ تالاب کی تعمیر میں ان کو خاص اہتمام کرنا پڑا ہوگا۔

---

[۱] دیکھو فہرست مطبوعہ صفحہ ۱۴۔

کنگرہ جیسا کہ ابھی لکھا گیا یہ موضع میر محمد مومن کو بطور جاگیر ملا تھا اور اُس زمانہ میں حویلی حیدرآباد میں شامل تھا۔ اب اطراف بلدہ کے جنوبی تعلقہ میں واقع ہے۔ اسکی نسبت مولوی مصلح الدین صاحب بی۔اے نے جو معلومات فراہم کیں وہ حسب ذیل ہیں:—

"کنگرہ، راؤریال سے قریب جانب جنوب مشرق واقع ہے۔ اور دونوں کو جانے کا ایک ہی راستہ ہے۔"

راؤریال کے ساتھ ہی اس کا بھی معائنہ کیا گیا۔ یہ دونوں گاؤں اب ایک دوسرے سے اتنے مل گئے ہیں کہ نئے آدمی کے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ کونسا حصّہ راؤریال سے متعلق ہے اور کونسا کنگرہ سے۔ اسی قربت کی وجہ سے شاید سلطان محمد قلی قطب شاہ نے میر صاحب کو موضع کنگرہ بطور جاگیر عنایت کر دیا تھا۔

کنگرہ میں بھی ایک مسجد ہے جو راؤریال کی مسجد سے بڑی ہے۔ لیکن وہ بھی قطب شاہی عہد کی تعمیر نہیں معلوم ہوتی۔

مامڑپلی میر صاحب کی جاگیرات کی فہرست میں تیسرے نمبر پر "موضع مامڑپلی حویلی حیدرآباد" کا نام درج ہے۔ یہ موضع اس وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی جاگیر ہے۔ فہرست دیہات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے اس میں ۱۲۵ مکان ہیں جن میں ۴۵۳ لوگ (۲۳۵ مرد اور ۲۱۸ عورتیں) آباد ہیں[1]۔

---

[1] دیکھو فہرست دیہات ضلع میدک مطبوعہ محکمہ اعداد و شمار سرکار عالی صفحہ ۱۰۔

اِس موضع کے معائنہ کے سلسلہ میں مولوی مصلح الدین صاحب انصاری تحصیلدار نے مہربانی سے حسب ذیل معلومات فراہم کردیں۔

"مامڑپلی جاگیر مہاراجہ بہادر ہے۔ اور پہاڑی شریف (بابا شرف الدینؒ) سے دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس موضع کو جانے کے لئے دیہی راستہ ہے۔ یہ مقام پہاڑی شریف سے جانب مغرب واقع ہے۔ موڑ پر ایک تختی آویزاں ہے جس پر موضع کے نام کی صراحت ہے۔"

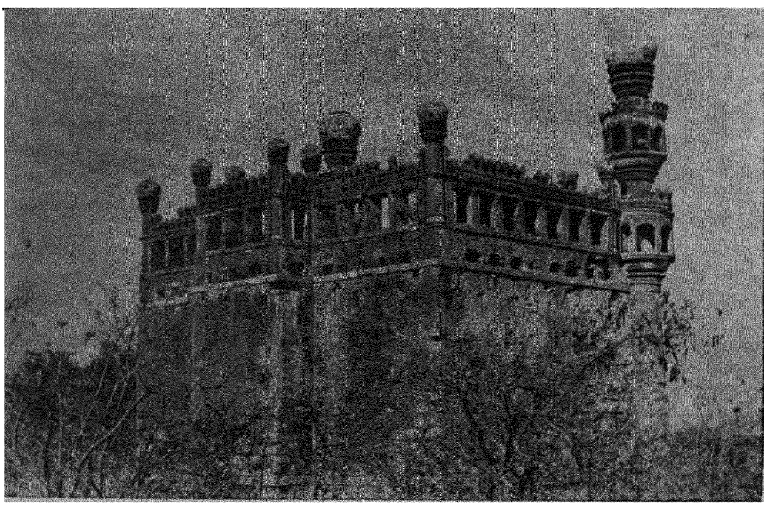
چنانچہ راقم نے مولوی سید محمد تقی صاحب اور راجہ دین دیال کے ہمراہ اِس موضع کا معائنہ کیا۔ پہاڑی شریف سے تھوڑی دور دیہی راستہ ہے جس پر گذرنے کے بعد موڑ کا سفر منقطع کرکے پیدل چلنا پڑا۔

مسجد چند فرلانگ کے فاصلہ پر ایک بڑی مسجد نظر آئی جو یقیناً میر صاحب ہی کی بنوائی ہوئی ہوگی۔ لیکن اس پر کتبہ موجود نہیں ہے چونکہ رواق میں جگہ جگہ شکستگی کے آثار نمایاں ہیں اِس لئے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کتبہ لگایا بھی گیا تھا یا نہیں۔ ممکن ہے کہ لگایا گیا ہو اور گذشتہ ساڑھے تین سو سال کے عرصہ میں کسی وقت لوگوں نے اس کتبہ کو تلف کردیا۔ جس طرح میر پیٹھ واقع کوہ مولا علی کا کتبہ بعد کو مجروح کردیا گیا۔

مامڑپلی کی مسجد کے اطراف بھی میر صاحب نے اپنی دوسری مسجدوں کی طرح وسیع صحن چھوڑ کر دیوار اٹھادی تھی جس کے آثار اب تک نظر آتے ہیں۔ اس مسجد کے مقابل جانب مشرق پہاڑوں کا ایک ایسا سلسلہ چلا گیا ہے کہ منظر کے لحاظ سے یہ جگہ ایک خاص سنجیدہ اثر پیدا کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ میر صاحب نے چلہ کشی اور عزلت گزینی کی خاطر بابا شرف الدین علیہ الرحمۃ کی درگاہ سے قریب



میر محمد مومن
کی مسجد ماموڑپلی
کے دو رخ



پہاڑوں کی اوٹ میں یہ مسجد بنائی ہو۔

میر صاحبؒ کی دوسری مسجدوں کے مقابل اس مسجد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے منار بہت اونچے ہیں۔ کتبہ کی عدم موجوگی میں اس مسجد کی تاریخ کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

موضع مامڑپلی میں اس وقت زیادہ تر ہندو آباد ہیں۔ اور مسلمانوں کے دو تین ہی مکان ہیں اور چونکہ گاؤں مسجد سے فاصلہ پر واقع ہے اس لئے یہ جنگل میں ویران وسنسان کھڑی ہے۔ اس کے قریب ہی جانب شمال مشرق ذرا نشیب کی طرف ایک بہت بڑا مندر بنا ہوا ہے اور وہ بھی جاترا کے دنوں کو چھوڑ کر ہمیشہ ویران پڑا رہتا ہے اس مندر کی جانب شمال ایک تالاب ہے جو غالباً میر صاحب ہی کا بنایا ہوا ہوگا۔ مگر یہ تالاب راؤ ریال کے تالاب کے اتنا بڑا نہیں ہے بلکہ میر پیٹھ واقع کوہ مولا علی کے جیسا ہے۔

جرلہ پلی

میر صاحبؒ کی جاگیرات کی فہرست میں چوتھا نام جرلہ پلی کا درج ہے۔ لیکن فارسی رسم الخط کی وجہ سے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ لفظ چرلہ پلی ہے یا جرلہ پلی۔ بہرحال ان دونوں ناموں کے مقامات کی تلاش کی گئی تو معلوم ہوا ہے کہ کوہ شریف سے قریب ایک گاؤں چرلہ پلی واقع ہے جو اس وقت مجاوران کوہ شریف کی جاگیر ہے اس میں ۱۴۲ مکان ہیں جن میں ۴۲۸ نفوس (۲۱۰ مرد اور ۲۱۸ عورتیں) آباد ہیں[1]۔

چرلہ پلی قریب کوہ مولا علی

اس موضع سے متعلق مولوی میر عباس علی صاحب (جو کوہ مولا علی کے

[1] دیکھو فہرست دیہات ضلع اطراف بلدہ مطبوعہ سرکار عالی صفحہ ۱۳۔

مجاوروں اور جاگیرداروں سے ہیں) سے معلوم ہوا کہ اس میں کوئی قدیم قطب شاہی مسجد نہیں ہے۔ اور نہ وہاں جانے کے لئے کوئی سڑک ہے۔ صرف وہی راستہ ہے جس پر سے موٹر کا جانا ممکن نہیں۔ اس لئے اس کے معائنہ کا خیال ترک کر دینا پڑا۔

جرلہ پلی قریب نارکٹ پلی

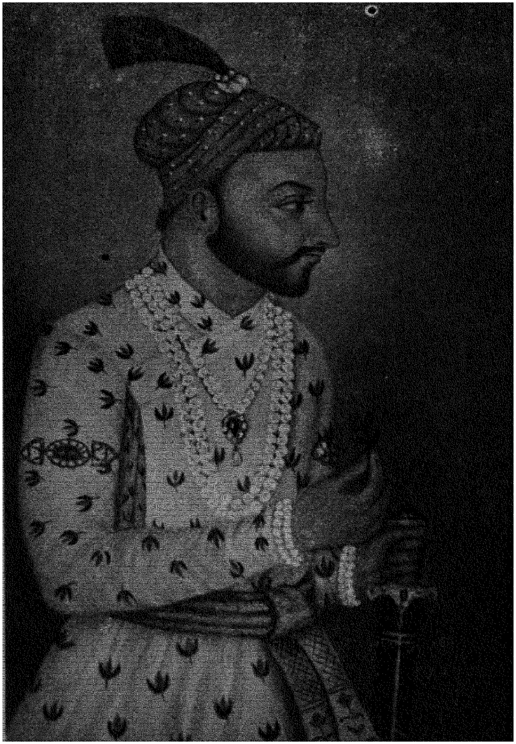
دوسرا مقام جو جرلہ پلی کے نام سے مشہور ہے بلدہ حیدرآباد سے ۵۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اس کی نسبت مولوی مصلح الدین صاحب انصاری تحصیلدار ضلع باغات نے جو معلومات فراہم کیں وہ یہ ہیں:—

"جرلہ پلی بلدہ حیدرآباد سے ۵۶ میل کے فاصلہ پر سڑک نلگنڈہ پر واقع ہے۔ راستہ میں نارکٹ پلی موٹر جنکشن پڑتا ہے۔ یہاں دریافت سے صحیح راستہ معلوم ہو جائے گا اس لئے کہ اس مقام سے دو راستے جاتے ہیں جن میں سے ایک موضع زیر بحث کو جاتا ہے۔"

لیکن یہ جرلہ پلی شہر حیدرآباد سے اتنی دور واقع ہے کہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ شاید ہی میر صاحب کا گاؤں ہو۔ کیونکہ ان کے جملہ گاؤں حیدرآباد کے قرب و جوار میں واقع ہیں۔ اس مقام کے معائنہ کی کوشش جاری ہے۔

چوتھا حصّہ

پیشوائی سلطان محمد قطب شاہ



سلطان محمد قطب شاہ (میر صاحب کا معتقد)



سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی

شہزادہ سلطان محمد کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی اکلوتی دختر حیات بخشی بیگم کی شادی دراصل سلطان محمد کی ولیعہدی کا اعلان تھا۔ اور جیسا کہ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں لکھا گیا ہے میر مومن صاحب نے شاہ ایران کے پیام کو مسترد کر کے اس شاہزادی کا نکاح سلطان محمد سے محض جانشینی کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے کرادیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ امن و اطمینان سے زہد و ریاضت میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور مسجدوں اور تالابوں کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اگرچہ بادشاہ کی عیاشانہ طرز زندگی سے وہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ عمر طبعی تک نہیں پہنچ سکے گا لیکن شاید ہی کسی کو اس امر کا علم ہو کہ محمد قلی اس شادی کے صرف دو ڈھائی سال کے اندر ہی دنیا سے کوچ کر جائے گا۔

چنانچہ وہ ماہ رمضان ۱۰۲۰ھ میں بیمار پڑا اور ڈھائی مہینہ تک بخار کا سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ اس میں روز بروز شدت ہوتی گئی۔ اور آخری دو دنوں میں تو اس مرض نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ بادشاہ حد درجہ ضعیف ہو گیا اور سنبھلنے کی امید باقی نہ رہی۔ آخر کار ہفتہ کی صبح میں بتاریخ ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

جب سلطان محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کی خبر حضرت میر مومن کو ملی وہ فوراً اپنی حویلی سے "دولت خانۂ عالی" میں آئے اور بادشاہ کی وصیت کے مطابق اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اگر اس موقع پر میر صاحب مستعدی اور عجلت سے

کام نہ لیتے تو شہر میں ہنگامہ پیدا ہو جاتا[1] اور سلطنت کے کئی دعویدار اُٹھ کھڑے ہوتے چنانچہ تاریخ کے الفاظ ہیں :۔

"اوباشان ستمگار جفاکیش واقعہ طلب کہ ہوائے قتل و غارت غریباں درسر داشتند خواستندکہ دریائے فتنہ را بطلاطم درآورند، دریں اثنا آوازہ جلوس پادشاہ دین پناہ سلطان محمد قطب شاہ بلند گشت و مصیبت زدگاں کہ سراسیمہ شدہ بودند از شر و شور اوباشان محفوظ ماندہ مطمئن خاطر گردیدند"[2]۔

اِس سے ظاہر ہے کہ خدابندہ یا اس کے سنی اور دکنی طرفداروں کی طرف سے غیر ملکیوں کو بڑا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ اس لئے خود محمد قلی قطب شاہ نے سلطان محمد کو اپنا جانشین بنانے کے لئے میر محمد مومن کو کئی بار (یعنے بیماری سے قبل اور اثنائے علالت میں بھی) وصیت کر دی تھی۔ اس وصیت اور میر صاحب کی مستعدی کا تذکرہ خود میر صاحب کی زندگی ہی میں ان الفاظ میں درج تاریخ کیا گیا تھا :۔

"چوں خبر انتقال خاقان فردوس مکان بہ عالی حضرت سیادت مرتبت، مشتری منزلت، خورشید اوج فضل وکمال، مہر سپہر عزت و اقبال، مرتضائے ممالک اسلام، مقتدائے طوائف انام، الواثق بتائید المہیمن، میر محمد مومن کہ رکن السلطنتہ، و پیشوائے این دولت خانہ بود، رسید فی الفور متوجہ بارگاہ عرش اشتباہ گردیدہ حسب الوصیت

---

[1] تاریخ قطب شاہی (قادر خاں) صفحہ ۲۴ ۔

[2] تاریخ محمد قطب شاہی ورق ۲۸۷ و حدیقتہ السلاطین صفحہ ۲۶۰ ۔

خاقان جنت آشیاں کہ ہم درمیان صحبت وہم در وقت اشتداد مرض فرمودہ بود .... سلطان محمد قطب شاہ را .... بر سریر دارائی نشانید، و بعز مبایعت و متابعت آں شاہ دین پناہ عزت اندوز گردید"۔[1]

آخری جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحبؒ نے سلطان محمد کی تخت نشینی کو مستند بنانے کیلئے سب سے پہلے خود بیعت کی اور اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کیا۔

جلوس تخت نشینی اگرچہ میر صاحبؒ نے رفع فساد کے لئے اعلیٰ تدبر سے کام لیکر سلطان محمد کو ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ کی صبح ہی میں تخت نشین کر دیا اور شہر میں اس کی بادشاہت کا اعلان ہو چکنے کے بعد اپنے قدیم آقا کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا لیکن نئے بادشاہ کے جلوس شاہی کیلئے انھوں نے یوم عید قرباں کا تعین کیا۔ چنانچہ بائیس دن کے بعد دس ذیحجہ ۱۰۲۰ھ کو سلطان محمد قطب شاہ نے بڑے اہتمام سے تخت شاہی پر جلوس کیا اور اس تقریب میں سب سے پہلے خود میر محمد مومن نے قصیدۂ تہنیت پیش کیا۔

قصیدۂ تہنیت میر مومن صاحبؒ کا یہ قصیدہ تاریخی حیثیت رکھنے کے علاوہ شاعرانہ کمال اور معانی و مطالب کی لطافتوں کے لحاظ سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف عام شاعروں اور مداحوں کی طرح خوشامد اور تعریف نہیں

---

[1] دیکھو تاریخ محمد قطب شاہی ورق ۲۸۷ ا اور حدیقۃ السلاطین صفحہ ۲۶۶۔ موخر الذکر تاریخ میں تاریخ قطب شاہی کی اکثر عبارتیں بعینہ درج ہیں۔

کی گئی بلکہ ایک مربی اور مشفق بزرگ کی طرح بادشاہ کو دعا اور مشورے دئے گئے ہیں۔ پورا قصیدہ تکلف اور تصنع سے پاک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مصرعہ دل سے نکلا ہے۔ اور ہر لفظ صداقت و اخلاص میں ڈوبا ہوا ہے۔

مرحوم بادشاہ کی یاد اس قصیدے کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مرحوم بادشاہ کا ذکر بھی بڑے اچھے الفاظ میں دردمندی کے ساتھ کیا گیا ہے حالانکہ عام طور پر شاعر صرف بادشاہ وقت ہی کی مدح و ستایش کرتے ہیں اور مرحوم بادشاہ کا ذکر تک نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس کو معیوب و منحوس سمجھتے ہیں۔ لیکن میر محمد مومن صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ وہ محض پیشوائے سلطنت بھی نہ تھے۔ بلکہ وہ گذشتہ اور موجودہ دونوں بادشاہوں کے مشفق اور مخلص مشیر اور رہادی و رہبر بھی تھے۔ اس لئے ان کو بےجا خوشامد اور ابن الوقتی کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم یہ مسئلہ ایسا نازک تھا کہ میر صاحب جیسے دانشمند اور پاکباز ہی اس کو چھیڑ سکتے تھے چنانچہ وہ اپنے قصیدے میں کہتے ہیں:—

میں نے پھر محبت کرنے کا ایک نیا پیمان کیا ہے اور نئے محبوب کے آگے اپنی پرانی جان قربان کر رہا ہوں۔

اگرچہ میں ضعیف و خستہ جاں ہوں لیکن میری جانفشانی یعنے جذبۂ خدمت تازہ ہے کیونکہ نئے بادشاہ کا عہد ہے اور اس میں نئی نئی عید قرباں آئی ہے۔

اگرچہ آسمان نے عالم میں یکایک آگ لگا دی تھی لیکن نئی بارش کے فیض سے دنیا پھر سے جنت بن گئی۔

اگرچہ قضا کے حکم سے (سلطان محمد قلی کی وفات کیا ہوی گویا) دنیا والوں
کی جان برباد ہوگئی لیکن (سلطان محمد کی تخت نشینی سے) ایک نئے مسیحا کی وجہ سے
پھر دنیا کو نئی زندگی مل گئی۔[1]

ایرانیت کی تبلیغ

میر مومن صاحب نے یہ قصیدہ اگرچہ صرف دس پندرہ روز کے اندر ہی لکھا تھا لیکن یہ اُن کی پوری زندگی کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے انکی شاعرانہ قابلیت، طبیعت کی دردمندی اور احسان شناسی، عالی دماغی اور تدبر، خلوص اور صداقت غرض ان کی طبیعت اور مسلک نمایاں طور پر جھلکنے لگتا ہے۔

ہم نے اس امر کا پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ میر صاحب کی سب سے بڑی حکمت عملی یہ تھی کہ سلطنت قطب شاہیہ کو ایران کا نمونہ یا ایک جزو بنادیں۔ اسی لئے انھوں نے سیکڑوں ایرانیوں کو عہد محمد قلی میں حیدرآباد میں سرخرو اور شاہی دربار میں باریاب کیا۔ اور اسی مسلک کی خاطر انھوں نے حیات بخشی بیگم کی شادی شاہزادہ ایران کے بالمقابل سلطان محمد سے کرادی تاکہ محمد قلی کے بعد خدابندہ اور اس کے دکنی طرفدار سلطنت پر قابض نہ ہوجائیں۔

سلطان محمد قلی اگرچہ فطرتاً ہندوستانیت اور دکنیت کی طرف مائل تھا لیکن میر محمد مومن اس کو ہمیشہ ایرانیت کی طرف راغب کرتے رہے ورنہ کیا تعجب کہ وہ بھی اپنے معاصرین جلال الدین اکبر بادشاہ اور ابراہیم عادل شاہ نورس کی طرح مذہب سے بیگانہ اور ہندو ثقافت کا دیوانہ بن جاتا۔

---

[1] اصل اشعار قصیدہ میں ملاحظہ ہوں جو اس کتاب کے چھٹے حصہ میں درج ہے۔

سلطان محمد قلی کے بعد سلطان محمد تخت نشین ہونے والا تھا اس لئے میر صاحب نے شروع ہی سے اس کو ایران کا گرویدہ بنا دیا تھا اور چونکہ وہ چچا کی طرح عیش و عشرت کا دلدادہ نہ تھا بلکہ ایک متقی و پرہیزگار جوانِ صالح تھا اس لئے میر مومن صاحب کو محمد قلی کے مقابلہ میں اس کو متاثر کرنے میں زیادہ کامیابی ہوئی چنانچہ سلطان محمد بالکل ایرانی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کے دور میں اُردو کے مقابل فارسی کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ عمارتوں اور باغوں کی تعمیر میں بھی ایرانی وضع قطع کا زیادہ لحاظ رکھا گیا غرض حیدرآباد ایران کا ایک شہر بن گیا۔

میر مومن صاحب بادشاہ کو جن طریقوں سے ایرانیت کی طرف مائل کرتے تھے ان میں سے ایک اس قصیدہ میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی بار بار ایران کا تذکرہ اور سلطنت قطب شاہی کی ایران سے تشبیہ۔ وہ قصیدے کے گریز یہ کہتے ہیں:۔

یادگار جد و عم سلطاں محمد قطب شاہ — آں کہ ہندوستاں زفیضش گشتہ ایران نوی

وہ چہ ایراں، آنچناں ایراں کہ آید در نظر — رو بہر جانب کہ آری باغ رضوان نوی

گریز کے بعد مدح کے آخری حصہ میں لکھتے ہیں:۔

سرمہ شد خاکِ تلنگانہ زفرخ پائے تو — اے فدائے خاک پاکت ہر زماں جان نوی

گو صفاہاں نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ — حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوی

یعنی تلنگانہ کی خاک میں تیرے مبارک قدموں کی وجہ سے سرمہ کی سی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ اگر شاہجہاں عباس شاہ کی وجہ سے صفاہاں بالکل نیا بن گیا تو اے بادشاہ تیری وجہ سے حیدرآباد صفاہانِ نو نظر آتا ہے۔

اور یہ سب باتیں محض اس لئے کہی گئیں کہ محمد قطب شاہ کے دل میں خیال پیدا ہوا اور وہ بھی اپنے شہر کو ایرانی طرز کا بنادے۔ چنانچہ مورخوں کے بیان سے اس کا ثبوت ملتا ہے جب کہ انھوں نے باغ اور باغ محمد شاہی وغیرہ کی عمارتوں کی تعمیر کے بیان میں صاف طور پر لکھا ہے کہ بادشاہ نے یہ سب عمارتیں ایرانی طرز کی بنائیں[1]۔

اسی لئے میر محمد مومن کے وہ اشعار صحیح معنوں میں پیشین گوئی ثابت ہوئے جن میں انھوں نے لکھا ہے کہ

اے بادشاہ تیری وجہ سے ہندستان ایران نظر آنے لگا اور ایران بھی کیسا ایران جس میں ہر طرف ایک نئے باغ رضواں کی شان جھلکتی ہو[2]۔

یہ سب خیالات میر صاحب نے اس وقت منظوم کئے تھے جب کہ محمد قطب شاہ کو تخت نشین ہوئے صرف آٹھ دس روز ہی گذرے تھے اور تعمیر وغیرہ کا ابھی خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا اسطرح گویا ابتدا ہی سے انھوں نے سوچ رکھا تھا کہ نئے بادشاہ کے ذریعہ سے کیا کیا کام کرانے ہیں۔

ذاتی تعلقات

میر صاحب کے اس قصیدے سے ان کے ذاتی تعلقات اور طبیعت کا بھی بڑا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ وہ وزارت عظمیٰ یا منصب پیشوائی کو صرف ایک ملازمت نہیں سمجھتے تھے۔ اور روپے پیسے کی خاطر اس عہدہ پر فائز نہیں تھے بلکہ ضعیف

---

[1] حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے "بطرز عمارات عراق" دیکھو صفحہ ۲۲۔

[2] یہ اشعار پہلے پیش کئے گئے ہیں دیکھو صفحہ ۱۱۴۔

اور خستہ جاں ہونے کے باوجود محض بادشاہ کی عقیدت اور دوستی کی وجہ سے یہ کام انجام دیرہے تھے۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ؎

محمد قلی قطب شاہ کی جدائی سے مہر و محبت کا جو رشتہ ٹوٹ گیا تھا اب اس کی وجہ سے دوسرے محبوب کے ساتھ نیا عہد و پیمان باندھ رہا ہوں۔ اس وقت اگرچہ بوڑھا (کہنہ جاں) ہوگیا ہوں لیکن اس ضعیفی میں بھی نئے محبوب کیلئے جانفشانی کرنے تیار ہوں۔ اگرچہ محمد قلی قطب شاہ کے پیشوا کی حیثیت سے بیس[20] سال تک کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں (خستہ جانم کہنہ) لیکن جانفشانی کے جذبات تازہ ہیں۔

سلطان محمد قطب شاہ سے میر صاحب کو جو دلبستگی تھی اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا:۔

بہر دفع چشم بد در پیش چشمانِ خوشش — اے دریغا کاش بودے ہر دمم جان نوی
دل براہِ دوست ہر دم وادئی طے می کند — کو فضا افگن پے شہ طرح ایوان نوی
نو دکان کہنہ بر چیں عقل از فرزانگی — دوستدارے بہر ما بکشو د دوکان نوی
از دعا گوئے چو مومن ہم دعا بہتر کہ ہست — او کہن داعی و تو شاہ جہانبان نوی
بادیا رب جاوداں ایں شاہی و اقبال و تخت — ہر دمت فتح نوی ہر لحظہ فرمان نوی

دوسرا قصیدہ سلطان محمد کی تخت نشینی کی تقریب میں میر محمد مومن نے اور ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جس میں کئی مصرعوں میں سال تاریخ نکالا تھا مثلاً

بہر تاریخ جلوس او مسیح عقل گفت پادشاہ بے بدل سلطاں محمد قطب شاہ
نام و وصفش دانی و سال جلوسش گر کنی جمع با صاحب کرم سلطاں محمد قطب شاہ

یہ قصیدہ بھی تخت نشینی کے بعد ہی دس بارہ روز کے اندر لکھا گیا ہوگا اور اِسی کا مصرع

بندۂ شاہ نجف سلطاں محمد قطب شاہ

بادشاہ نے اپنی شاہی مہر میں کندہ کرالیا تھا۔ لیکن میر صاحب کے اِس قصیدہ کے جو اشعار تاریخوں میں نقل کئے جاتے ہیں ان میں وہ شعر درج نہیں ہے جس کا مصرع ثانی بادشاہ نے اپنی مہر کے لئے منتخب کیا تھا۔

یہ قصیدہ بھی مہر و محبت کے جذبات سے مملو ہے۔ اگرچہ پہلے قصیدہ کے مقابلہ میں شاعرانہ نکات کے لحاظ سے کم درجہ کا ہے لیکن اِس میں مدحیہ و دعائیہ اشعار زیادہ ہیں۔ اس میں بھی دردمندانہ لہجہ میں محمد قلی کے انتقال کا تذکرہ کیا ہے۔

یہ دونوں قصیدے میر صاحب کی تصنیفات و تالیفات کے بیان میں درج کئے جائیں گے۔

شاہ ایران سے تعلقات

شاہ طہماسپ صفوی کے انتقال کے بعد اگر اسمٰعیل مرزا کی جگہ میر محمد مومن کا شاگرد شاہزادہ حیدر مرزا تخت نشین ہوجاتا تو میر صاحب کو ایران سے ہجرت کرنے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ لیکن اس جواں سال شہزادہ کی شہادت نے میر صاحب کو بڑا صدمہ پہنچایا اور خاصکر اسمٰعیل کی بدعنوانیوں نے تو ان کو بالکل برخواستہ خاطر کردیا اور وہ ہندوستان چلے آئے۔

لیکن میر صاحب کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ وہ اگرچہ دکن میں رہتے تھے لیکن اُن کا دِل ایران میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کوئی شخص ایران سے آتا وہ اس کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے اور ان کی اسی قدردانی سے سیکڑوں ایرانی حیدرآباد میں شاد کام رہے ہیں۔ نہ صرف عام ایرانیوں بلکہ وہاں کے شاہی خاندان کے ساتھ بھی میر محمد مومن کو ایک والہانہ محبت تھی۔ چنانچہ شاہ عباس صفوی نے اپنے فرمان میں جو ان کے نام روانہ کیا تھا اس کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

طریقۂ اخلاص و دُعاگوئی آں سیادت ونقابت پناہ بدیں دودمان ولایت نشان

بواجبی برضمیر منیر اشرف ظاہر است"

میر صاحب کے نام شاہِ ایران کا فرمان

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے آخر عہد میں جب اغزلو سلطان سفیر ایران کے ساتھ قنبر علی گولکنڈہ سے ایران روانہ کیا گیا تھا تو اس کی اور خود اغزلو سلطان کی زبانی شاہ عباس کو میر صاحب کے حالات اور اقتدار کا پورا علم ہو چکا تھا۔ اور وہ قنبر علی کو گولکنڈہ واپس بھی نہ کرنے پایا تھا کہ محمد قلی کا انتقال ہو گیا اور نیا بادشاہ تخت نشین ہوا۔ اس نئے حکمران کی نسبت بھی شاہ عباس کو معلوم تھا کہ یہ میر محمد مومن کا شاگرد اور تربیت یافتہ ہے اس لئے اس نے جب سلطان محمد قطب شاہ کے نام تعزیت و تہنیت کا فرمان بھیجا تو پیشوائے سلطنت میر محمد مومن کے نام بھی علیحدہ ایک فرمان روانہ کرنا ضروری خیال کیا۔ چنانچہ یہ فرمان ماہ رمضان ۱۰۲۲ھ میں لکھا اور حسین بیگ قبچاقی کے ذریعہ سے حیدرآباد روانہ کیا گیا۔ جب حسین بیگ ہرمز کے راستہ سے بندر دابل کو پہنچا تو حیدرآباد میں سلطان محمد قطب شاہ کو اس کی خبر ہوئی۔ اس نے غالباً میر صاحب کے مشورے سے سیادت پناہ مرزا زین العابدین

مازندرانی کو سفیر ایران کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔ یہ شخص شائستگی، فضل و کمال اور حفظ مراتب اور تعظیم و تکریم میں اس وقت حیدرآباد میں فرد فرید سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ حیدرآباد سے سفیر کے لئے تشریفات خسروانہ کے علاوہ خرچ سفر اور مہمانداری کے لئے خاطر خواہ رقم اور دیگر اشیاء روانہ کی گئیں۔ چنانچہ زین العابدین نے وہاں پہنچکر بڑی دھوم دھام اور اعزاز و اکرام سے حسین بیگ اور اس کے اسی ساتھیوں کا خیر مقدم کیا۔ اور دونوں ملکر حیدرآباد کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ہر جگہ اور ہر منزل میں حیدرآباد کی طرف سے مراسم ضیافت ادا کئے جاتے تھے۔ جب یہ سب لوگ قطب شاہی سلطنت کی سرحد پر پہنچے تو حیدرآباد سے انیبا قلی خاں کو دیگر امرائے سلطنت کے ساتھ سرحد پر استقبال کرنے کے لئے روانہ کیا گیا۔ ان لوگوں نے حسین بیگ اور اسکے ساتھیوں کی ایسی دعوت اور خاطر مدارات کی کہ سفیر ایران پر اہل حیدرآباد کی شائستگی اور شان و شوکت کا بڑا اثر پڑا۔

آخرکار اس تزک و احتشام کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دس رجب ۱۰۲۳ھ کو حسین بیگ قبچاقی شہر حیدرآباد کے حدود میں داخل ہوا تو بادشاہ اور اعیان دربار نے آگے بڑھ کر "کالا چبوترہ" کے پاس اس کا استقبال کیا۔ اس وقت سفیر نے فرمان کے علاوہ وہ تحف و تحایف[1] سلطان محمد قطب شاہ کی خدمت میں پیش کئے جو شاہ ایران نے روانہ کئے تھے۔ اسی کے ساتھ میر محمد مومن کو بھی شاہ عباس کا فرمان حاصل کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا کہ جس پر میر صاحب

---

[1] ان تحایف کی تفصیل تاریخوں میں درج ہے اور اس کتاب میں بھی آئندہ ذکر کیا جائے گا۔

جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔

غرض رمضان ۱۰۲۲ھ میں میر صاحب کے نام جو فرمان لکھا گیا تھا وہ دس ماہ بعد میر صاحب کو وصول ہو گیا۔ حسن اتفاق سے اس فرمان کو مصنف حدائق السلاطین نے اپنی تاریخ میں درج کر کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے کئی باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے تو یہ کہ شاہ ایران کی نظر میں میر صاحب کی بڑی وقعت تھی۔ چنانچہ اس نے ان کو ایسے عالی شان القاب کے ساتھ یاد کیا ہے جو بادشاہوں کے بعد کسی اور کے لئے شاید ہی فرامین میں استعمال کئے جا سکتے تھے۔ وہ لکھتا ہے۔

"سیادت و نقابت پناہ' افادت و افاضت دستگاہ' مستجمع الفضائل و الکمالات' شمسا للسیادۃ والنقابۃ والدین' امیر محمد مومنا' استر آبادی"۔

ان القاب کے بعد اس امر کا یقین دلایا گیا ہے کہ شاہ ایران کے الطاف و عنایات میر صاحب کے شامل حال ہیں اور رہیں گے اور یہ کہ ان کی ہر آرزو اور امید پوری ہو سکتی ہے۔ پھر اعتراف کیا ہے کہ میر صاحب خاندان شاہی ایران کے ساتھ جو خلوص و اعتقاد رکھتے ہیں اس سے شاہ ایران بخوبی واقف ہے۔ ذاتی تعلقات کے بعد سلطنت قطب شاہی کا ذکر کیا گیا ہے کہ قدیم الایام سے گولکنڈہ کے سلاطین محب اہل بیت اور صفوی خاندان کے ہوا خواہ رہے ہیں۔ اس لئے ہم بھی اس سلسلۂ رفیعہ کو اپنے سے متعلق اور منسوب سمجھتے ہیں۔

میر صاحب کی خدمات کا اعتراف

اس کے بعد پھر میر صاحب کا ذکر ہے کہ ان عقیدت مند بادشاہوں کے ساتھ میر صاحب کا رہنا اتفاقات حسنہ میں سے ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ

شاہ ایران میر صاحب کی ایران دوستی کو سیاسی نقطۂ نظر سے کتنی اہمیت دیتا ہے۔ یعنے سلاطین گولکنڈہ کی قدیمی دوستی کے باوجود میر صاحب کا قیام حیدرآباد بادشاہ کی نظر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"وہر آئینہ بودن آں حقایق آگاہ درمیان آں طبقۂ عقیدت گزیں از اتفاقات حسنہ است"

اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ کی وفات اور سلطان محمد کی تخت نشینی کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے ضروری ہوا کہ ہم اپنے کسی معتمد درگاہ کو نئے بادشاہ کی دلجوئی کے لئے روانہ کریں۔ چنانچہ حسین بیگ قبچاقی کو بھیج رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر شاہ ایران نے ایک ایسا جملہ لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دربار گولکنڈہ میں میر صاحب کے اثر و اقتدار سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یعنے وہ کہتا ہے کہ آپ بدستور اخلاص و ہواخواہی کے ازدیاد کی کوشش کرتے رہیں اور دونوں خاندانوں کے باہمی مراسم کے احیا کی کوشش کریں۔ یہ مطلب ایسے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ یہ ایک طرح کی استدعا معلوم ہوتی ہے۔ شاہ ایران کے الفاظ ہیں :-

"می باید کہ آں سیادت و نقابت پناہ بدستور در ازدیاد مواد اخلاص و دعاگوئی کوشیدہ
در احیائے مراسم خدمتگاری قدیم ایں دودمان قدسی نشان مساعی باشد"

ساتھ ہی یہ بھی خواہش کی ہے کہ ایلچی کو سابق کی طرح حیدرآباد میں زیادہ دن تک نہ ٹھہرالیں بلکہ ایسی تدبیر کریں کہ وہ بہت جلد ایران کو واپس ہو سکے۔

آخر میں اس امر کی بھی تاکید ہے کہ ہمیشہ ہم سے مراسلت کر کے اپنی خواہشات اور ارادوں سے مطلع کرتے رہو اور بے دریغ شاہی نوازشات کی امید رکھو۔

اِس مشفقانہ فرمان کے ایک ایک لفظ سے محبت و اخلاص کی بو آتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عباس صفوی جیسا شہنشاہ ایران میر صاحب کی کتنی قدر و منزلت کرتا تھا اور ان کے اثر و اقتدار کا کتنا قائل تھا۔ چونکہ اس فرمان کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور یہ صرف حدائق السلاطین میں منقول ہے جس کے ایک ہی نسخہ کا اس وقت تک پتہ چلا ہے اس لئے اس کو من و عن ذیل میں نقل کیا جاتا ہے تاکہ محفوظ ہو جائے۔

فرمانِ شاہِ عباس صفوی

فرمان ہمیوں شرف نفاذ یافت آں کہ سیادت و نقابت پناہ، افادت و افاضت دستگاہ، مستجمع الفضایل والکمالات شمساً للسیادۃ والنقابۃ والدین امیر محمد مومنا استرابادی بوفور عواطف و الطاف شاملہ شاہانہ و صنوف مکارم و اعطاف کاملہ پادشاہانہ عز اختصاص و شرفِ امتیاز یافتہ، توجہ خاطر اقدس بانتظام احوال و انجاح امانی و آمال خود باعلیٰ درجہ تصور نمودہ بداند کہ طریقۂ اخلاص و دعاگوئی آں سیادت و نقابت پناہ بدیں دودمانِ ولایت نشان، بواجبی بر ضمیر منیر اشرف ظاہرست، و شفقت و مرحمت خسروانہ دربارۂ آں نقابت منقبت درجہ کمال دارد۔ وچوں از قدیم الایام سلاطین نصفت آئین گلکنڈہ کہ بمحبت و ولائے خاندان طیبین و طاہرین شرف امتیاز دارند، بایں خاندان خلافت مکان طریقۂ اخلاص و ہواخواہی مسلوک داشتہ و دارند۔ لہٰذا ما نیز آں سلسلۂ رفیعہ را بخود متعلق و منسوب می دانیم۔ و ہر آئینہ بودن آں حقائق آگاہ درمیان آن طبقۂ عقیدت گزین از اتفاقات حسنہ است۔ و درین وقت کہ غفراں پناہ والی سابق آں ولایت دعوت

حق را اجابت نمودہ سریر دولت آں خانوادہ علیہ بوجود گرامی عالی جناب سلطنت و شوکت پناہ والاجاہ المخصوص بعواطف الملک الالہ شمساً للسلطنۃ سلطان محمد قطب شاہ آرایش یافتہ بنا بر عطوفت و اشفاق جبلی لازم گشت کہ یکے از معتمدانِ درگاہ را بتفقد و دلجوئیِ سلطنت و جلالت پناہ والا دستگاہ فرستادہ شود، لاجرم رفعت پناہ مقرب الحضرت العلیۃ العالیہ حسین بیگ قبچاقی را بہ محل اعتماد ہمایون ماست روانہ فرمودیم۔ می باید کہ آں سیادت و نقابت پناہ بدستور در از دیاد مواد اخلاص و دعاگوئی کوشیدہ در احیائے مراسم خدمتگاری قدیم این دودمان قدسی نشان ساعی باشد، و بخلاف سابق توقیف ایلچی را دراں دیار جائز نداشتہ در روانہ نمودن رفعت پناہ موی الیہ اہتمام لازم داند۔ و نوعے نماید کہ بزودی روانہ خدمت اشرف گردد۔ وہموارہ عرایض اخلاص آئین بپایۂ سریر والا فرستادہ مطالب و مدعیات کہ داشتہ باشد عرض نماید کہ بعز الحاح اسعاف مقرون است۔ و بہمہ جہتے بنوازشات بے دریغ شاہی واثق و امیدوار باشد۔ تحریراً فی شہر رمضان المبارک سنہ اثنی وعشرین والف من الہجرۃ۔

میر صاحب کا اخلاص اس شفقت آمیز فرمان کے جواب میں میر محمد مومن نے جو عرضداشت شاہ ایران کی بارگاہ میں روانہ کی اس کی نقل بھی انفاق سے حدایق السلاطین میں درج ہے۔ اس میں میر صاحب نے خود کو شاہ ایران کا موروثی دعاگو ظاہر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اگرچہ میں نصیب اور تقدیر کے اقتضا سے آپ کی بارگاہ سے دور رہوں لیکن اس انتہائی خلوص کے باعث

جو مجھے دربارِ ایران سے ہے خود کو آپ سے قریب ہی سمجھتا ہوں اور نزدیک رہنے والوں سے زیادہ آپ کی خدمت انجام دیتا رہتا ہوں۔ اگرچہ مجھے قربت سے محروم رہنے کا افسوس ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہوں کہ وہاں کے حالات سے اجنبی ہو گیا ہوں۔

اس کے بعد قطب شاہی خاندان کا ذکر کیا ہے کہ اس کے افراد شاہان ایران کے معتقد و مرید ہیں اور ان کی خدمت میں رہنے کو خود شاہ ایران کی خدمت میں رہنے کے برابر قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر کا بھی ذکر کر دیا ہے کہ دکن میں مقیم رہنے کی وجہ سے اس سرزمین کی مسجدوں میں اور منبروں پر ائمہ معصومین اور شاہ ایران کا خطبہ پڑھا جا رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں اس امر کی معذرت بھی چاہی ہے کہ اگر میری طرف سے آپ کی خدمت میں کم عریضے پہنچتے ہوں تو برا نہ مانئے اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ میں خود کو اس مرتبہ عظیم کے قابل نہیں سمجھتا اور غائبانہ دعا کیا کرتا ہوں اور چونکہ اس وقت بعض دوستوں سے معلوم ہوا کہ آپ میرا عریضہ چاہتے ہیں اس لئے لکھنے کی گستاخی کر رہا ہوں۔

آخر میں دعا دی ہے اور غالباً اپنے علم کی قوت سے پیشین گوئی کی ہے کہ قریبی زمانہ میں آپ کو تازہ فتوحات کی خوشخبری ملے گی۔

اب ہم میر صاحب کے اصل خط کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

جواب فرمان

شاہا ز تو عالمند در امن و حضور — ایں دولت راز لطف حق نیست فتور
گرہم چو توی یافت شدی پیش از تو — دولت نشدے بہ بے وفائی مشہور

عرضداشت احقر بندگان و اخلص دعاگویان محمد مومن بعد از تقبیل تراب

آستان ہما آشیان کہ قبلہ گاہ آمال و محط دولت و اقبال است بعرض ایستادگان بارگاہ آسمان جاہ عالمیان پناہ کاسمان درعرض حال خود بایشان ملتجی است می رساند کہ این بندۂ داعی موروثی اگرچہ بمقتضائے نصیب و تقدیر از ان درگاہ عالی بظاہر دور از خدمت مہجور ست اما از غایت خلوص بندگی کہ بآن درگاہ دارد در باطن خود را از نزدیکان می داند و بیش از اکثر نزدیکان بلوازم بندگی و دعاگوئی قیام و اقدام می نماید اگرچہ بواسطۂ این محرومی غایت تاسف و کلفت خاطر دارد اما بکرمہ سبحانہ درحالے واقع نشدہ کہ اجنبی از آن آستان باشد بلکہ در ظل ولی النعمتی واقعست کہ بر عالمیان ظاہر ست کہ صاحبان آں دولت بدل و جان از مریدان موروثی آں دودمان ولایت نشان بودہ اند و نسلی ظاہر باین ست کہ درین حدود و کشور مساجد و منبر بعد از تزئین بذکر اسامی مبارکہ حضرات عالیات چہاردہ معصوم مزین و مشرف بنام نامی و القاب گرامی آں شہنشاہ والاگہر دین پناہ عدالت گستر و آباء کرام قدسی مقام آں نور بخش ہفت کشور ست ۔

سزد گر جبرئیل آید بریں فیروزہ گوں منظر — کند آفاق را خطبہ بنام شاہ دیں پرور

جہاں پناہا از روئے گستاخی بمسامع اقبال می رساند کہ اگر ازین بندہ داعی کمتر عرضہ داشت بدرگاہ جہاں پناہ رسیدہ سبب آں لغیر ازیں نیست کہ خود را از غایت حقارت قابل ایں مرتبۂ عظمی ندانستہ و بدعاہائے غائبانہ سرّے کہ بانتجابت اقرب و از شائبۂ ریا ابعد است اشتغال نمودہ چوں درین ولا از بعضے برادران دینی

و دوستان یقینی بقدر اعلامی واقع شد که ازاں قبلہ عالمیان اشارہ باشارت درباب
فرستادن عریضہ از غایت عنایت عزصدور یافتہ بدین گستاخی جرات و اقدام نمود
و باین چند کلمہ فاتح ابواب ظاہری گردید وخود را مذکور مجلس بہشت آئین گردانید
امید کہ تاقیام قائم آل محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین این دولت عظمیٰ و سلطنت
کبریٰ یوماً فیوماً در تزاید و تضاعف و تصاعد باشد وچنانکہ در اکثر اوقات ماضیہ
واقع شدہ در اغلب ازمان مستقبلہ نیز نوید فتوحات تازہ و نصرتہائے بے اندازہ
ازاں دولت روز افزوں بساکنان ربع مسکوں می رسیدہ باشد زیادہ ترک
ادب نہ نمود۔

تاہست جہاں شاہ شاہجہاں باد ہر نوع کہ خواہد دلش ایام چناں باد

بحق محمد والہٖ الامجاد۔

سفیر ایران کی مہمان داری

یہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ حسین بیگ قبچاقی ۱۰ ارجب ۱۰۲۳ھ کو حیدرآباد پہنچا تھا۔ وہ اپنے ساتھ جہاں سلطان محمد قطب شاہ کے لئے "تاج مرصع" کمر شمشیر" کمر خنجر مکلل بجواہر آبدار" پچاس بادسیر سبک رفتار گھوڑے (جن کی زین اور لگام مرصع اور باگ زرکش تھی) اور دیگر تحف و نفائس شاہانہ[1] شاہ ایران کی طرف سے لے آیا تھا یقین ہے کہ میر محمد مومن پیشوائے سلطنت کے لئے بھی کوئی تحفے ضرور لایا ہو مگر افسوس ہے کہ تاریخوں میں

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۲۷۰

ان کی تفصیل درج نہیں۔

سلطان محمد قطب شاہ نے سفیر ایران اور اس کے اسی ساتھیوں کو "تشریفات شاہانہ اور عنایات خسروانہ" سے سرفراز کیا۔ ان سب کے قیام کے لئے وسیع اور اعلیٰ مکانات کا انتظام کیا۔ اور سالانہ بیس ہزار ہون اخراجات قیام کے لئے دیتا رہا۔ یہ مقررہ رقم اُن تشریفات، گھوڑوں اور ہاتھیوں کے سوا ہے جو موقع بموقع اس سفیر اور اس کے ساتھیوں کو عطا کئے گئے۔

اس شاہی ضیافت و اہتمام کے علاوہ یہ امر یقینی ہے کہ میر محمد مومن نے بھی بحیثیت پیشوائے سلطنت سفیر ایران کی ضیافت اور مہمانداری کی ہو گی۔ انھوں نے اس امر کا بھی التزام کیا کہ جہاں تک ہو سکے بہت جلد سفیر ایران شاہ عباس کی خواہش کے مطابق ایران کو واپس جا سکے۔

سفیر ایران کی واپسی

چنانچہ میر صاحب کی سعی و کوشش سے یہ ایلچی صرف دو سال چار مہینے کے قیام حیدر آباد کے بعد وسط ذیقعدہ ۱۰۲۵ھ میں برہان پور کی راہ سے ایران کی طرف روانہ ہوا۔ سفیر ایران کو جلد واپس کرنے میں میر صاحب کی غیر معمولی سعی اور کامیابی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ اس سے قبل جو سفیر (یعنے اغزلو سلطان) حیدر آباد آیا تھا اس کو چھ سال تک یہاں قیام کرنا پڑا اور اس سے قبل رخصت عطا نہیں کی گئی۔ اس کے برخلاف میر صاحب نے حسین بیگ کو ڈھائی سال کے اندر ہی حیدر آباد سے روانہ کرا دیا۔ اس وقت بھی شاہ ایران کے لئے اعلیٰ تحفے مثلاً

"تحف فراوان و مرصع آلات مشحون بجواہر قیمتی و اقمشۂ نفیسہ کہ مانہا عاملان درگاہ در اتمام آن سعی موفور بظہور رسانیدہ بودند"[1]

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۲۷۰

حسین بیگ قبچاقی کے ذریعہ سے بھیجے گئے اور اس کو چار ہزار ہون خرچ راہ کے لئے بھی عطا کئے گئے۔

علامہ ابن خاتون کو ایران بھیجنا

جس طرح گذشتہ موقع پر سفیر ایران کے ساتھ حاجی قنبر علی کو بھیجا گیا تھا اسی طرح اب کے میر محمد مومن کے شاگرد اور دست گرفتہ شیخ محمد ابن خاتون کو ایران روانہ کیا گیا۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ سفیر ایران کے قیام دکن، اور واپسی، اور جواب کے طور پر حیدرآباد کی سفارت کی روانگی میں میر محمد مومن کو کتنا زیادہ دخل تھا۔ انہوں نے اپنی مصلحت عملی کے تحت اپنے ہی آدمی کو ایران روانہ کیا اور غالبًا اپنا جواب بھی علامہ شیخ محمد ابن خاتون ہی کے توسط سے شاہ ایران کی خدمت تک پہنچایا۔ شاہ ایران نے ابن خاتون کی بڑی قدر و منزلت کی۔ نظام الدین احمد نے لکھا ہے :-

"بخدمت بادشاہ گیتی پناہ مشرف شد وچند سال دراں مملکت جنت مثال بودہ مورد توجہات پادشاہی ومشمول عنایات نامتناہی گردیدہ"[۱]

ایران سے واپسی کے بعد علامہ ابن خاتون کسی عہدہ پر مامور نہ ہونے پائے تھے کہ سلطان محمد کا انتقال ہوگیا حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے :-

عالی جناب علامی شیخ محمد الشہیر با بن خاتون را کہ از حجابت سفر وممالک ایران مراجعت نمودہ بود وخاقان علیین مکان مغفور ارادہ داشتند کہ منصب بزرگے کہ مناسب رتبہ ومنزلتش باشد تفویض فرمایند کہ قضیۂ ہایلہ روئے داد"[۲]

---

[۱] حدیقۃ العالم صفحہ ۲۰۰ — [۲] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۲۹ -

شہزادہ عبداللہ مرزا کی پیدائش

سفیر ایران کو حیدرآباد آئے ہوئے ابھی چار مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ سلطان محمد قطب شاہ کے محل میں ۲۰ رشوال ۱۰۲۳ھ کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ مرزا رکھا گیا اور چونکہ یہ پہلی اولاد تھی اِس لئے بادشاہ نے بڑی خوشی منائی اور میر محمد مومن نے بھی ایک قطعہ تاریخ پیدائش لکھا۔

حدیقتہ العالم میں لکھا ہے:۔

"از جملہ آں تواریخ تاریخیست کہ نواب علامی فہامی پیشوائے اہل ایمان میر محمد مومن طاب ثراہ در قطعۂ درج فرمودہ۔ و مادہ اش اینست۔

کام بخش جہاں ہا"[1]

میر صاحب کے لئے یہ موقع خاص خوشی کا ہوگا کیونکہ انھوں نے تقریبًا بائیس سال قبل خود سلطان محمد کی پیدائش کا قطعۂ تاریخ لکھا تھا اور اب انھیں اِس کے فرزند کی تاریخ پیدائش منظوم کرنے کا موقع ملا۔

میر صاحب کے فرزند میر مجدالدین محمد نے بھی اِس خوشی میں حصّہ لیا اور دو قطعے (ایک عربی اور ایک فارسی) لکھے۔ جن میں یہ مادہائے تاریخ درج کئے۔

(۱) قرۃ العین الانسان

(۲) اولِ فتح وظفر آخرِ رنج والم

---

[1] حدیقتہ العالم صفحہ ۲۷۴۔

پیشین گوئی

شہزادہ عبداللہ مرزا کی پیدائش کے ذکر کے ساتھ ہی اِس واقعہ کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جب منجموں نے اس کا زائچہ دیکھ کر یہ بتایا کہ بادشاہ شہزادے کو بارہ سال تک نہ دیکھے تو اِس پیشین گوئی کی تصدیق میر صاحب نے بھی اپنے علم و عملیات سے کی ہوگی ورنہ سلطان محمد جیسا پابند شرع اور متقی بادشاہ اس پر ہرگز عمل نہ کرتا۔ اس کا ثبوت اِس طرح بھی ملتا ہے کہ اس شاہزادہ کی پرورش اور اتالیقوں کے انتخاب میں میر صاحب کو آخر تک دخل رہا ہے۔ اگر وہ عام نجومیوں کے اس بیان کو صحیح نہ پاتے تو ہرگز ان توہمات پر بادشاہ کو عمل پیرا نہ ہونے دیتے۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ جب تک میر صاحب زندہ رہے سلطان محمد نے اِس بندش پر سختی سے عمل کیا اور ان کے انتقال کے بعد ہی مدت معینہ کے اختتام سے قبل شہزادہ عبداللہ کو اپنی بارگاہ میں بلا بھیجا۔ اور چونکہ بارہ سال کے ختم سے پہلے ہی اس نے اپنے فرزند کو دیکھ لیا تھا اس لئے نجومیوں کے قول کے مطابق یہ ملاقات بادشاہ کی جان پر بھاری ثابت ہوی اور وہ اس واقعہ کے چند روز کے اندر ہی انتقال کر گیا۔

شہزادہ علی مرزا کی ولادت

سفیر ایران اور علامہ شیخ محمد ابن خاتون کی حیدرآباد سے روانگی سے دو تین ہفتہ قبل ۲۸ رشوال ۱۰۲۵ھ بروز دوشنبہ سلطان محمد قطب شاہ کے محل میں ایک اور شہزادہ پیدا ہوا جس کا نام علی مرزا رکھا گیا۔ اس دوسرے فرزند کی ولادت سے بادشاہ زیادہ خوش ہوا۔ اور اس تقریب میں شاعروں نے بڑے بڑے قصیدے اور تہنیتی نظمیں لکھکر اُس کی خدمت میں پیش کیں اور انعام واکرام سے سرفراز ہوئے۔

اِس موقعہ پر غیر معمولی اظہار مسرّت کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پیشرو بادشاہ سلطان محمد قلی اولادِ نرینہ سے محروم رہا تھا اور بادشاہِ وقت کو ٹھیک دو سال میں دو فرزند ہو گئے اور دوسری وجہ یہ کہ شہزادہ عبداللہ مرزا کی پیدائش سے جو خوشی ہوئی تھی وہ اُس پیشین گوئی اور قید و بند کی وجہ سے غم و تشویش میں مبدل ہو گئی تھی کہ بادشاہ بارہ سال تک اپنے فرزند کی صورت نہ دیکھے۔ چنانچہ اس واقعہ سے بھی اس فکر و تشویش کا ثبوت ملتا ہے کہ میر محمد مومن پیشوائے سلطنت نے شہزادہ عبداللہ مرزا کی پیدائش کے وقت جو قطعہ تاریخ لکھا تھا وہ کسی تاریخ میں درج نہیں ہے۔ صرف مادۂ تاریخ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف علی مرزا کی پیدائش کی مسرت میں جو قطعہ لکھا گیا تھا وہ تاریخوں میں محفوظ ہے۔

قطعۂ تاریخ میر محمد مومن نے اِس قطعہ تاریخ میں پہلے اس امر کا ذکر کیا ہے کہ "خدا نے سلطان محمد کو دو فرزند عطا کئے ہیں جو رشکِ شمس و قمر ہیں۔ چونکہ دونوں کے درمیان صرف دو سال کا فرق ہے[1] اِس لئے میں ایک کی تاریخ کام بخش جان ہا اور دوسرے کی کام بخش بجا نہاسے نکالتا ہوں" یعنے حرف ب بڑھا کر دو کے عدد کا اضافہ کر دیا ہے اس کے بعد بادشاہ کو بڑے خلوص سے دعا دی ہے۔ ان کا قطعہ ہے:—

خدائے داد بقطب شہاں محمد شاہ　　　دو شاہزادہ کہ ہستند رشکِ شمس و قمر

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ مرزا اور علی مرزا دونوں کی پیدائش کا دن اور تاریخ ایک ہی ہے یعنے دوشنبہ ۲۰ شوال۔ اور صرف سنہ میں فرق ہے۔ ایک کا ۱۰۲۳ ہے اور دوسرے کا ۱۰۲۵۔

دو نور بخش بعالم کہ چوں پدر ہستند | ز رحمت ازلی نیک بخت و نیک اختر
میان ہر دو چو آمد تفاوت دو سال | چو خواہی از پے تاریخ شاں شدی رہبر
حساب سال یک از "کام بخش جاہنا" جو | ز "کام بخش بجاہنا" حساب آں دیگر
دعائے ہر دو مرا خوش رسیدہ است ز غیب | عجب خجستہ دعائے ز ہر دعا خوشتر
کہ باد دولت و اقبال شاں بعمر خضر | بظل چتر ہمایون جاں فزائے پدر
کدام شاہ بود آں کہ در کمال آمد | بہ فہم و فضل ارسطو، بہ دولت اسکندر
چو ذات اقدس او را ز مدح استغناست | مرا دعائے دگر بہ بہ پے سخن زیور
ز حادثات زمانہ پناہ ذاتش باد | خدائے جل جلالہ، بحق پیغمبر

آخری اشعار میں سلطان محمد کی منفی طبیعت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ خوشامد اور مدح و ستائش کو پسند نہیں کرتا اس لئے اپنے سخن کی آرائش کے لئے صرف دعا ہی سے کام لیتا ہوں۔

اس قطعہ کے ابتدائی اشعار سے یہ بھی گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید میر صاحب نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی پیدائش کے وقت کوئی قطعہ تاریخ نہیں لکھا کیونکہ وہ اپنے علم و عملیات کے ذریعہ سے سمجھ گئے ہوں گے [1] کہ یہ شہزادہ اپنے باپ سلطان محمد قطب شاہ اور خود سلطنت قطب شاہیہ کے لئے منحوس ہے۔ اسی لئے اس وقت خاموشی اختیار کی اور دوسرے شہزادہ کی پیدائش کے وقت شہزادہ عبداللہ مرزا کی تاریخ پیدائش کا مادہ بھی لکھدیا ورنہ ضرور تھا کہ تاریخوں میں وہ قطعہ بھی درج کیا جاتا۔

---

[1] اگر نظام الدین احمد مولف حدیقۃ السلاطین نے صاف طور پر لکھا نہ ہوتا کہ :-

اس امر کی وضاحت اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ایرانی سفیر حسین بیگ قبچاقی سلطان عبداللہ کی پیدائش کے وقت بھی حیدرآباد میں موجود تھا لیکن اس وقت اس نے بھی شاید کوئی قطعہ تاریخ نہیں لکھا اس کے برخلاف شہزادہ علی مرزا کی پیدائش کی مسرت میں اس نے حسب ذیل قطعہ لکھا تھا

سفیر ایران کا قطعۂ تاریخ

شکر ایزد لہ از مکارم غیب — شد جہاں را حیات نو در تن
از قدوم منیر پادشہی — شد تلنگانہ تازہ و رشک ختن
گوہرے این چنیں چو روئے نمو — خواستم زینتے دہم بسخن
پے تاریخ مولدش رفتم — تا برم خوشہ ازیں خرمن
بختم آمد بہ نزد عقل بگفت — کیں سخن را بگوش دار ز من
سال تاریخ اوست دیدۂ بخت — دیدۂ بخت باد از و روشن

۱۰۲۵

ارکین سلطنت کا انتخاب

سلطان محمد قطب شاہ اگرچہ اپنے چچا محمد قلی سے زیادہ لائق اور متقی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اول تاریخ کہ نواب علامی فہامی پیشوائے عالمیان میر محمد مومن طاب ثراہ یافتہ اند و در قطعہ درج فرمودہ اند "کام بخش جاہنما"۔

تو حالات کے تحت یہی نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ میر صاحب نے اس موقعہ پر کوئی اظہار مسرت نہیں کیا تھا۔

اور امور سلطنت میں دخیل تھا لیکن اس کے عہد میں بھی سلطنت کے عہدوں پر میر محمد مومن کی رائے و مشورے کے بغیر کسی کا تقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے ثبوت کے طور پر تاریخ حدیقۃ السلاطین کے حسب ذیل چند جملے کافی ہیں:—

۱ میر محمد رضائے استرآبادی را کہ بعد از خواجہ مظفر علی منصب دبیری بتوجہ نواب علامی مرتضائے ممالک اسلام مرحمت کردہ بودند۔ (صفحہ ۲۸)

۲ نواب مرتضائے ممالک اسلام میر محمد مومن، مولوی را بجہت ایں خدمت پسندیدہ مجدداً بشرف ملاقات خاقان زماں مشرف ساختہ خلعت ایں خدمت عالی را بر قامت قابلیت مولوی مرتب داشتند (صفحہ ۱۰)

۳ اعلیٰ حضرت خاقان سلیمان منزلت بصلاح و صوابدید نواب علامی فہامی مرتضائے ممالک اسلام میر محمد مومن قرار دادند کہ خدمت للکی شاہزادۂ عالم بہ منشی الممالک خواجہ مظفر علی مقرر دارند" (صفحہ ۹)

ان اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی اہم عہدہ خالی ہوتا تو میر صاحب کی صلاح و صوابدید اور پسندیدگی و توجہ کے بغیر کوئی شخص اس پر مامور نہیں ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر ذیل میں چند ایسے لوگوں کے حالات لکھے جاتے ہیں جن کی نسبت تاریخوں سے علم حاصل ہو سکتا ہے۔

خواجہ مظفر علی منشی الممالک یہ ان خوش بخت صاحبان فضل و کمال میں سے تھا جن کو حیدرآباد میں میر محمد مومن کی مدد سے خاص عزت اور شہرت نصیب ہوئی۔ یہ سلطان محمد قطب شاہ کا دبیر تھا یعنے منشی الممالک کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا تھا اور بعد کو جب

۱۰۳۱ھ میں شہزادہ عبداللہ مرزا کے للہ میرزا شریف شہرستانی (داماد میر قطب الدین نعمت اللہ شیرازی[1]) کا انتقال ہوا تو میر صاحب نے مظفر علی کو دبیری کے ساتھ ساتھ اس اعزاز للگی پر بھی سرفراز کیا۔ لیکن وہ ایک لائق آدمی تھا کوئی بڑا امیر تو نہ تھا اِس لئے اس کے مکان میں شہزادہ عبداللہ مرزا کے قیام کے لئے ایک قصر رفیع بنایا گیا۔ جس کو طرح طرح کے تکلفات اور تصرفات سے آراستہ کیا گیا۔ غرض ایک ادیب اور عالم کے مکان نے بہت جلد شاہی محل کی صورت اختیار کرلی۔ خود خواجہ مظفر علی کو اس غیر معمولی عزّت و امتیاز کا احساس تھا۔ اس نے قصر کو نگارخانۂ چین کی طرح آراستہ کیا اور قسم قسم کے ابریشمی اور زربافت کپڑے پائے انداز کے طور پر بچھائے اور بہت سا زر و جواہر شہزادہ کی آمد کے وقت بطور صدقہ نچھاور کیا۔ اس طرح سلطنت کے اعیان و اکابر میں خاص رتبہ و امتیاز حاصل کیا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں :-

"بایں منصب رفیع بر اکابر و اعیانِ عالم افتخار و مباہات نمود"[2]

لیکن افسوس ہے کہ مظفر علی اس اعزاز سے زیادہ دن محظوظ نہ ہوسکا وہ تقریباً ڈیڑھ سال اس شان و شکوہ کی زندگی بسر کرنے کے بعد اپنے محسن میر محمد مومن کی وفات سے چند ماہ قبل ہی انتقال کرگیا۔ اور اس کے بعد میر صاحب نے مولٰنا حسین شیرازی کو شہزادہ کا للہ مقرر کیا۔ ان کا تفصیلی

---

[1] ان دونوں (یعنے خسر اور داماد) کے گنبد حیدرآباد کے محلہ مغلپورہ میں اب تک موجود ہیں اور ان پر نہایت عمدہ کتبے کندہ ہیں۔

[2] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹

تذکرہ اس کتاب کے صفحات ۷۲ تا ۸۱ میں درج ہے۔

میر محمد رضا استرآبادی منشی الممالک و پیشوا

یہ میر صاحب کا ہم وطن اور بہت بڑا فاضل تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا اس کو میر محمد مومن سے کوئی رشتہ بھی تھا یا نہیں۔ البتہ نام کی وضع سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً ان کے رشتہ داروں میں ہوگا۔

میر صاحب کے نبیرے مولوی میر عباس علی صاحب کے خاندانی کاغذات میں ۱۵ محرم ۱۰۹۵ھ کا لکھا ہوا ایک کاغذ بھی نظر سے گذرا جس میں ایک میر محمد رضا استرآبادی کے ورثہ کی تقسیم کا حال درج ہے۔ اس کاغذ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد رضا کے والد میر سید علی تکی ولد میر سید ابراہیم استرآبادی بڑے پایہ کے بزرگ تھے[1]۔ میر محمد رضا کے انتقال کے وقت ان کی ایک لونڈی ریحانہ گل بیگی تھی جس کو ان کے بعد ایک لڑکی تولد ہو کر فوت ہوگئی اور ریحانہ کو ورثہ میں چار ہزار چھ سو روپے ملے تھے۔ اس تاریخی کاغذ کی تفصیل آئندہ میر صاحب کی اولاد و اعزہ کے تذکرہ میں درج کی جائے گی۔ یہاں اس کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا کہ میر صاحب کی اولاد کے قبضہ میں اس کاغذ کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ میر صاحب کو یا تو ان میر محمد رضا سے کوئی تعلق تھا یا پھر خود ان کی اولاد میں کوئی اور صاحب اس نام کے گذرے ہیں۔

---

[1] اس کاغذ میں میر محمد رضا کا نام اس طرح لکھا ہے :۔

"مرحمت و مغفرت پناہ میر محمد رضا ولد سیادت ہدایت نقابت دستگاہ و عمدۃ النجباء العظام میر سید علی تکی ولد میر سید ابراہیم استرآبادی"۔

بہرحال میر محمد رضا کو میر صاحبؒ نے مظفر علی دبیر کے انتقال کے بعد منصب دبیری پر سرفراز کیا تھا۔ اور اس شخص نے سلطان محمد قطب شاہ کو اپنی لیاقت و اہلیت سے اتنا متاثر کیا تھا کہ خود میر صاحب کے انتقال کے بعد بادشاہ نے کسی کو پیشوائے سلطنت نہیں بنایا بلکہ میر محمد رضا ہی سے اس عہدہ سے متعلقہ کام بھی لیتا رہا۔ یہانتک کہ خود بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے:۔

"میر محمد مومن کہ برحمت ایزدی پیوست خاقان گیتی پناہ منصب جلیل القدر پیشوائی را بہیچ یک از مقربان سریر خلافت تفویض نہ فرمودہ....... جناب سیادت پناہ میر محمد رضائے استرآبادی را کہ بعد از خواجہ مظفر علی منصب دبیری بتوجہ نواز علامی مرتضائے ممالک اسلام مرحمت کردہ بودند بوساطت مشار الیہ نیز بعض مہمات سرانجام می یافت"۔ صفحہ ۲۸ ـ

سلطان محمد کی وفات کے ساتھ ہی اوائل عہد عبداللہ قطب شاہ میں میر محمد رضا استرآبادی کا ستارہ گہن میں آگیا اور خدمت دبیری بھی اس سے چھین کر علامہ شیخ محمد ابن خاتون کو دیدی گئی[1]۔ معلوم ہوتا ہے کہ عہد عبداللہ قطب شاہ میں شیخ محمد ابن خاتون اور میر محمد رضا ایک دوسرے کے رقیب تھے ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ خود امور سلطنت پر چھاجائے۔ غرض

---

[1] حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے:۔ "منصب دبیری را از محمد رضائے استرآبادی گرفتہ بعالی جناب علامی (شیخ محمد ابن خاتون) عنایت کردند" صفحہ ۲۹ ـ

آٹھ سال کے بعد ۱۰۴۳ھ میں پھر میر محمد رضا کا نیر اقبال طلوع ہوا۔ چنانچہ ۱۳ رجمادی الآخر کو علامہ شیخ محمد ابن خاتون پر شاہی عتاب ہوا اور ان کی جگہ میر محمد رضائے استرآبادی کو پیشوائے سلطنت بنایا گیا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں :-

درشب سیزدہم جمادی الآخر سیادت پناہ میر محمد رضائے استرآبادی راتشریف منصب
پیشوائی مرحمت فرمودند و نواب علامی فہامی شیخ محمد را بنا بر سعایتے کہ از بعضے نسبت
بایشاں بہ ظہور رسید چند روز بر نشستن در منزل خود و ترک آمدن چاکری مامور ساختند[1]

لیکن مورخ چونکہ شیخ کا طرفدار تھا اس لئے اس نے اس واقع کو صرف چند روزہ بتایا ہے حالانکہ شیخ کو عرصہ تک معطل رہنا پڑا اور اس کے بعد بھی ان کو پہلے پیشوائی نہیں دی گئی بلکہ میر محمد رضا کے تحت میر جملہ بنایا گیا۔

غرض میر محمد رضا کے عروج اور علامہ شیخ محمد ابن خاتون کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میر صاحب نے منشی الممالک کے عہدہ کے لئے اس کا انتخاب کیا تھا۔

میرزا حمزہ استرآبادی مجلسی و سرخیل

مرزا بیگ فندرسکی کا بھتیجا اور میر محمد مومن کے فرزند میر مجد الدین محمد کا داماد تھا۔ میر صاحب ہی کی وجہ سے سلطان محمد قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوا اور ساٹھ ہزار ہون کی جاگیرات سے سرفراز

---

[1] حدایقۃ السلاطین صفحہ ۱۲۲ ۔

کیا گیا۔ بعد کو عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوا تھا۔ میرزا حمزہ کا تفصیلی تذکرہ میر صاحب کی اولاد کے بیان میں کیا جائے گا۔

خواجہ افضل ترکہ سرخیل

بڑا بہادر اور جری سپہ سالار تھا۔ تقریباً ۱۰۲۴ھ میں سرخیل بنایا گیا اور ایک لاکھ ہون تنخواہ کی جاگیرات عطا ہوئیں۔ اور جب تک میر محمد مومن زندہ رہے خواجہ افضل کا ستارہ چمکتا رہا ان کے انتقال کے بعد ہی سلطان محمد نے عہدۂ سرخیلی سے معزول کر دیا اور خواجہ ایک لاکھ ہون کی تنخواہی جاگیرات سے بھی محروم ہو گیا۔

سلطان محمد کے انتقال کے بعد جب منصور خاں حبشی میر جملہ ہوا تھا تو اس نے پھر ۱۰۳۵ھ میں خواجہ افضل کو سرخیل بنا دیا اور خواجہ دو تین ماہ کی نکبت و ذلت کے بعد از سر نو امرائے عظام میں داخل ہوا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں:۔

"مجدداً از جملۂ امرائے عظام گردید"[1]

خواجہ افضل سپاہی ہونے کے علاوہ مدبر اور تیز فہم بھی تھا۔ وہ علامہ شیخ محمد ابن خاتون کے بڑھتے ہوئے اثرات دیکھ کر اس کے طرفداروں میں شامل ہو گیا اور شاہ محمد ابن عرب شاہ پیشوا کی عرضیوں کو جو عادل شاہ کے نام لکھی گئی تھیں راستہ سے پکڑوا کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرا دیا اس طرح شاہ محمد کو معزول کرا کے شیخ محمد ابن خاتون کے لئے خواجہ افضل نے پیشوائی کا راستہ صاف کیا۔[2]

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۳۰ — [2] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۶۶

۱۰۳۹ھ میں جب مرتضیٰ نگر کے علاقہ میں بغاوت ہوئی تو بادشاہ نے خواجہ افضل ترکہ کو وہاں کا حاکم بنا کر سرکشوں کی تادیب و تنبیہ کے لئے روانہ کیا۔ خواجہ نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ مرتضیٰ نگر کا رُخ کیا۔ اور راستہ میں جو بھی شریر اور بدمعاش لوگ ملتے گئے ان کو سرِ راہ سولی پر چڑھاتا گیا تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ اس طرح مرتضیٰ نگر کو شر و فساد سے پاک کر کے امن و اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ اسی اثنا میں اس علاقہ کو قحط کی مصیبت سے بھی دوچار ہونا پڑا لیکن خواجہ افضل نے ایسے اچھے انتظامات کئے کہ مخلوق خدا زیادہ پریشان نہ ہونے پائی۔

مرتضیٰ نگر کی حکومت کرتے ہوئے دو سال گذر چکے تھے کہ ۱۰۴۱ھ میں صوبہ دار بنگالہ باقر خاں نے قطب شاہی علاقہ کیسکوٹ پر حملہ کر دیا اور وہاں کے حاکم سید عبداللہ خاں نے حیدرآباد کو عریضہ روانہ کر کے عبداللہ قطب شاہ سے امداد طلب کی۔ بادشاہ نے اس کام کے لئے خواجہ افضل کا انتخاب کیا اور فوراً مرتضیٰ نگر کو آدمی دوڑائے کہ لشکر و حشم کو چھوڑ کر بجلی کی طرح حیدرآباد آئے۔ جب خواجہ کو یہ خبر ملی تو سلطنت کی مدد کے لئے دوڑا اور اسّی فرسخ کے راستہ کو صرف تین دن میں طے کر کے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں :۔

"چوں ایں خبر بہ خواجہ رسید مصراع

ہماں ساعت ہماں لحظہ ہماں دم

بر اسپ باد پا سوار شدہ ہشتاد فرسخ راہ را در سہ روز طے نمودہ آستان رفیع الشان

خسرو سکندر اقبال را مسجد عبودیت ساخت"[۱]

---

[۱] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۸۱ —

اس اطاعت و وفاداری سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور ۲ رجب ۱۰۴۰ھ کو

"تشریف وخلعتِ خاص با اسپ وزین ولجام سیمیں"

مرحمت کیا۔ اور باقر خاں کی مدافعت کے لئے روانہ ہونے کا حکم دیا۔ خواجہ افضل کی سپہ سالاری میں پایۂ تخت سے شجاع الملک، شیر محمد خاں اور چند دکنی سردار، چند حوالہ دار، اور جمعیت خاصہ خیل کے ہزار سوار بھی روانہ کئے گئے۔ نیز کسیمکوٹ کے جملہ منیواروں، رؤسا اور زمینداروں کو حکم دیا گیا کہ خواجہ افضل کے مطیع ومنقاد رہیں اور اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا ہوں۔

غرض خواجہ افضل بڑے تزک واحتشام کے ساتھ کسیمکوٹ کی پہلی ولایت قلعہ راجمندری کی طرف متوجہ ہوا۔ خود خواجہ کا لشکر بھی جو قلعہ مرتضیٰ نگر میں تھا دریائے کرشنا پار کرکے مصطفیٰ نگر میں اردوئے خواجہ سے آملا۔ اس طرح خواجہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ راجمندری پہنچا۔ لیکن باقر خاں اس کی آمد آمد کی خبر سنکر پہلے ہی وہاں سے ہٹ گیا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے یہاں معذرت روانہ کی۔ تاریخ حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے :۔

"حاجبے بہ پایۂ سریر سکندر نظیر فرستادہ درمقام اعتذار شد و دیگر جرأت بہ پیش آمدن نہ نمود" صفحہ ۸۲ ۔

یہ حال دیکھ کر خواجہ افضل نے بادشاہ کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ اس کے لئے کیا حکم ہوتا ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ چند روز قلعہ راجمندری میں ٹھہر کر حیدرآباد کو واپس آجانا۔

۱۰۴۱ھ میں جب عادل شاہی سپہ سالار مرہری نے بے اعتدالی شروع کی اور قطب شاہی سلطنت پر دست درازی کا ارادہ کیا تو عبداللہ قطب شاہ نے پھر "شجاعت و وزارت دستگاہ

اعظم الامرا خواجہ افضل ترکہ" کی ضرورت محسوس کی اور اُس کو راجمندری سے حیدر آباد چلے آنے کا حکم دیا۔

اگرچہ راجمندری کے قیام کے زمانہ میں خواجہ افضل علیل ہوگیا تھا تاہم بادشاہ کا حکم پاکر وہ اس خراب حالت میں بھی وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور حیدر آباد پہنچ کر بادشاہ کی قدمبوسی حاصل کی۔ لیکن اس کی بیماری روز بروز شدت پکڑتی گئی یہانتک کہ میدانِ جنگ کو جانے کی جگہ اس نے ۱۰ جمادی الآخر ۱۰۴۱ھ کو دار الملک عقبیٰ کی راہ لی۔

اس کے یہاں ایک ہزار ترک، عرب اور عجمی سوار ملازم تھے۔ جو اس کے بعد یولچی بیگ کو مرحمت کروئے گئے۔ اور مرتضیٰ نگر کی حکومت پر اس کی جگہ میر فصیح الدین محمد تفرشی کا تقرر کیا گیا۔ غرض خواجہ افضل دیانت، وفاداری، اور اطاعت کے علاوہ تجمل، ثروت، اور امارت میں بھی اپنے امثال واقران میں ممتاز تھا۔ نظام الدین احمد نے لکھا ہے:۔

"بامارت ووزارت اشتغال داشت و بہ تجمل وثروت از امثال واقران بغایت ممتاز بود" صفحہ ۹۹۔

یولچی بیگ میر محمد مومن کے سمدھی یعنے اُن کے فرزند میر مجد الدین محمد کے خسر تھے۔ ان کا مکان میر صاحبؒ کی حویلی سے متصل تھا اور یولچی بیگ کی کمان اب تک حیدر آباد میں مشہور ہے۔

یہ سپاہی مشرب تھے اور سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اپنی شجاعت و تدبر کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ مورخین ان کو" اعظم الامرا شجاعت ووزارت دستگاہ" کے القاب کے ساتھ

یاد کرتے ہیں۔ رشتہ کی وجہ سے میر صاحب کے ساتھ ان کو جو تقرب حاصل تھا وہ ظاہر کرتا ہے کہ میر صاحب نے ان کے عروج میں کافی حصّہ لیا تھا۔ لیکن سلطان محمد کے عہد اور میر صاحب کی زندگی میں انھوں نے کیا کام انجام دئے معلوم نہ ہوسکا۔ البتہ عہد عبداللہ قطب شاہ میں یولچی بیگ نے حیدرآباد میں اپنی شجاعت و سپہ سالاری کا ڈنکہ بجا دیا تھا۔

جمادی الاول ۱۰۴۰ھ میں شریف الملک ملا محمد تقی تفرشی کی رائے سے بادشاہ نے ان کو کلبگور کے چودھری الپیا ولد پدا ریڈی کی سرکشی کو فرو کرنے کے لئے روانہ کیا۔ یولچی بیگ اپنے جملہ لشکر و حشم میں سے صرف بارہ[۲] کمانداروں چابک سواروں کو ساتھ لیکر سرشام گولکنڈہ سے نکلا اور اس رات اور دوسرے دن اور دوسری رات کو مسلسل سفر کرتا ہوا دور دراز کی مسافت کو بسرعت تمام طے کیا اور دوسرے روز علی الصباح اتنا سویرے کلبگور پہنچ گیا۔ الپیا اور اس کے بہادر ساتھی نیند سے بیدار بھی نہ ہونے پائے تھے۔ غرض ”اشجع الامرا یولچی بیگ“ اس کے دربانوں کو قتل کر کے گھر میں گھس گیا۔ الپیا ان کی آوازوں سے چونک پڑا اور تلوار سنبھال کر مقابلہ کرنا ہی چاہتا تھا۔ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا۔ اور فی الفور گولکنڈہ کو واپس ہوا۔ کلبگور کے غوغائیوں نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ اتنا تیز رفتار تھا کہ وہ اس کی ہوا کو بھی نہ پہنچ سکے۔ جب باغیوں کے سروں کو نیزوں پر چڑھائے ہوئے یولچی بیگ اور اس کے ساتھی دروازۂ قلعہ گولکنڈہ میں سے حیدرآباد میں داخل ہوئے تو بادشاہ اس بہادر کی شجاعت اور سرعتِ کار پر حیران رہگیا۔ اور اس مہم سے خوش ہوکر ”اسپ تازی بایراق زریں و تشریف طوکانہ“ عطا کرنے کے علاوہ الپیا کا اثاث البیت بھی جو بہت کافی تھا یولچی بیگ ہی کے سپرد کر دیا۔[۱]

۱۔ حدیقۃ السلاطین صفحہ ۷۷

۱۰۴۱ھ میں جب مرہری عادل شاہی سپہ سالار نے قطب شاہی حدود میں دست درازی کرنی چاہی تو بادشاہ نے پھر "اعظم الوزرا و اشجع الامرا یولچی بیگ" کو اس کے مقابلہ کے لئے نامزد کیا۔ لیکن آخر کار یہ لڑائی صلح پر ختم ہوی۔ اور یولچی بیگ کو اپنی شجاعت دکھانے کا موقع نہ ملا۔[1]

۱۰ ار جمادی الآخر ۱۰۴۱ھ کو جب قدیم سپہ سالار خواجہ افضل ترکہ کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے اسکی خدمت اور منصب پر یولچی بیگ کو سرفراز کیا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں:۔

"وبعد از او دنیائے معمور حوالہ اوراکہ قریب یک ہزار سوار ترک و عرب و عجم وغیرہ داشت بشجاعت و سخاوت دستگاہ یولچی بیگ مرحمت فرمودند"[2]

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ خواجہ افضل کے ماتحت ایک ہزار ترک و عرب و عجمی سوار یولچی بیگ کے تفویض کئے گئے۔ اور دوسری بات یہ کہ یولچی بیگ اپنے بذل و سخا کی وجہ سے بھی مشہور تھا۔

اس اثنا میں معلوم ہوا کہ شاہجہاں نے آصف خاں کو بیجاپور کی تسخیر کے لئے روانہ کیا ہے تو اہل حیدرآباد نے بھی اپنی سرحدوں کی حفاظت و نگرانی کا انتظام کیا چنانچہ یولچی بیگ بھی دوسرے سرداروں مثلاً خداویردی سلطان، قزلباش خاں، اور ویٹوجی کانتیا کے ساتھ سرحد کی حفاظت کے لئے روانہ ہوا۔[3] لیکن اس دفعہ بھی بلا ٹل گئی اور مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔ آخر کار یہ تمام سردار ماہ ذیقعدہ ۱۰۴۱ھ میں حیدرآباد واپس آئے۔ اور میدان وسیع الفضائے داد محل میں

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹۲ تا ۹۴ — [2] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹۹ —

[3] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰۱ تا ۱۱۰ —

بادشاہ کے سلام کے لئے حاضر ہوئے بادشاہ نے امرائے عالی شان کو تشریفات پادشاہی سے سرفراز کیا۔

۱۰۴۴ھ میں جب شاہِ ایران نے امام قلی بیگ شاملو کو سفیر بنا کر خیرات خاں کے ساتھ حیدرآباد روانہ کیا اور یہ لوگ غرۂ ذیقعدہ ۱۰۴۴ھ کو حیدرآباد کی سرحد پر پہنچے تو سلطان عبداللہ قطب شاہ نے پہلے تو میر معزالدین محمد مشرف الممالک کو پھر شیخ محمد طاہر سرخیل کو اور ان کے بعد یولچی بیگ کو استقبال کے لئے روانہ کیا جس نے زرق برق فوج اور تزک واحتشام کے ساتھ آگے بڑھ کر امام قلی بیگ کا استقبال کیا اور خیریت آباد تک پہنچایا۔

یکم رجب ۱۰۴۶ھ کو یولچی بیگ نے اپنے لڑکے کی ختنہ کی تو خود بادشاہ نے بھی اس تقریب میں شرکت کی۔ یولچی بیگ نے محل شاہی سے اپنے مکان تک جو تین ہزار قدم کے فاصلہ پر تھا تمام راستہ میں قیمتی پائے انداز بچھائے اور دو ہاتھی ۱۲ گھوڑے، ۵ اونٹ اور بڑا لعل نذر دیا۔ بادشاہ نے بھی اسکو خلعت سے سرفراز کیا۔ بادشاہ کی والدہ اور دیگر محلاتی سو پالکیاں بھی اسکے یہاں مدعو ہوئیں غرض اس تقریب نے یولچی بیگ کے رتبہ کو چار چاند لگا دیئے۔

اس اثنا میں بادشاہ نے یولچی بیگ کو مرتضیٰ نگر کی طرف روانہ کیا جہاں سے وہ ۲۶ ربیع الاول ۱۰۴۷ھ کو واپس ہوا۔ اسکے بعد ہی قلعہ کولاس کی حفاظت کے لئے روانہ کیا گیا جہاں سے ۱۰۴۹ھ میں بادشاہ نے بلا کر اپنے زمرۂ امرا میں شامل کر لیا۔ (مزید حالات کے لئے دیکھو حدیقۃ السلاطین حصہ دوم)۔

دیگر عہدہ دار

یہ تو ان خاص امرا و اراکین سلطنت کا ذکر تھا جو میر صاحب کی ابتدائی دستگیری اور توجہ کی وجہ سے حیدرآباد میں پورے عروج پر پہنچے اور جن کے متعلق تاریخوں سے بھی مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے اصحاب ہوں گے

جن کی میر صاحب نے سرپرستی کی تھی لیکن ان کی نسبت ہم اپنے محدود علم کی وجہ سے اس وقت کچھ نہیں لکھ سکتے۔

چونکہ سلطان محمد کے پورے دَور میں میر محمد مومن کی رائے و مشورہ کے بغیر کوئی شخص برسرِ اقتدار نہیں آیا اس لئے ہم اس دَور کی چند خاص شخصیتوں کے نام یہاں لکھ دیتے ہیں۔ تاکہ یہ معلوم ہو کہ میر صاحب کو اپنی زندگی کے آخری دَور میں کن کن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔

۱۔	قاسم بیگ ولد مرشد قلی بیگ ترکمان	کوتوال شہر حیدر آباد
۲۔	حسن بیگ شیرازی	نائب کوتوال ״ ״
۳۔	میر یزدی	ناظر الممالک (یعنے صدر المہام تعمیرات)
۴۔	میر قاسم اردستانی	״ ״ ״ ״ ״
۵۔	اعتماد راؤ برہمن	دبیر فرامین ہندوی
۶۔	ملک آدم	سر نوبت و حوالہ دار خاصہ خیل
۷۔	ملک یوسف	
۸۔	ملک الماس	حوالہ دار کارخانہ جات (مثل عمارات سرکاری و زرگر خانہ و زرادخانہ و توپخانہ)
۹۔	ملک عنبر	حوالہ دار جامدار خانہ عامرہ و فیل خانہ و طویلہ وغیرہ حوالہ دار دیدبانان
۱۰۔	مرزا روزبہان اصفہانی	سر خیل
۱۱۔	نارائن راؤ برہمن	مجموع دار (استیفائے ممالک)
۱۲۔	سرو رائے برہمن	شروع نویس

علمی ذوق کی اشاعت

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں میر محمد مومن نے پیشوائی اور وکالت مطلق کا جو کام انجام دیا اُس کا کوئی تذکرہ ان کی علمی خدمات کے اعتراف واظہار کے بغیر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس زمانہ میں ان کی ذاتی دلچسپی اور شوق نے حیدرآباد میں علم وفضل کی ایک صحت مند فضا پیدا کردی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس آخری دور میں میر صاحب مہمات مملکت اور دنیوی امور سے زیادہ دینی معاملات اور علمی کاموں میں مصروف رہے۔ خود بھی کتابیں لکھیں اور لوگوں سے بھی کئی کتابیں لکھوائیں۔ اس کے علاوہ متعدد عالموں اور فاضلوں کو اپنے غیر معمولی تبحر علمی سے فیض بھی پہنچایا۔ میر صاحب نے خود جو علمی کام انجام دیا اس کا تفصیلی بیان ایک علیحدہ باب "تصنیف وتالیف" کے تحت کیا جائے گا۔ البتہ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ان کے زیر اثر خود بادشاہ کا مطالعہ کتنا وسیع ہو گیا تھا اور دوسرے صاحبان کمال کس طرح تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔

سلطان محمد کا علمی شغف

یہ امر تو تاریخ کے ہر طالب علم پر واضح ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ کتابوں کا کیڑا تھا۔ وہ ہر کتاب کو شوق سے پڑھتا اس پر اپنے دستخط ثبت کرتا اور بعض اوقات اس کے متعلق اپنی یادداشت اور رائے بھی قلمبند کرتا تھا۔ چنانچہ اس وقت تک کئی ایسی کتابیں دستیاب ہوچکی ہیں جو سلطان محمد کے زیر مطالعہ رہ چکی تھیں اور جن پر خود بادشاہ نے اپنے قلم سے کچھ نہ کچھ تحریر کر دیا ہے۔ اس قسم کی بعض تحریروں کے عکس "حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" میں شائع کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں اس کی اس قسم کی بعض تحریریں درج کی جاتی ہیں۔

اپنے مرتب کئے ہوئے "کلیات محمد قلی قطب شاہ" پر اس نے حسب ذیل تحریر لکھی ہے :۔

"کلیاتِ اشعارِ فصاحت آثارِ جنت مکانی فردوس آشیانی مغفرت پناہ عمی عالی حضرت محمد قلی قطب شاہ نور مرقدہٗ تمام شد درکتابخانۂ مبارکہ بخط محی الدین کاتب بتاریخ اوایل شہر رجب المرجب سنہ خمس عشرین اعنی بعد الف من الہجریہ فی دارالسلطنۃ حیدرآباد حرس اللہ عن الاضداد۔ کتبہٗ العبد الخالص لمولاہ سلطان محمد قطب شاہ بلغہٗ اللہ تعالیٰ فیما یتمناہ"

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں بھی چند شاہی کتابیں ایسی ہیں جن پر سلطان محمد کے دستخط موجود ہیں۔ ان میں سے صرف دو کتابوں کی عبارتیں درج ذیل ہیں۔

"کیمیائے سعادت" کے سرورق پر رجب ۱۰۲۴ھ میں سلطان محمد نے لکھا ہے :۔

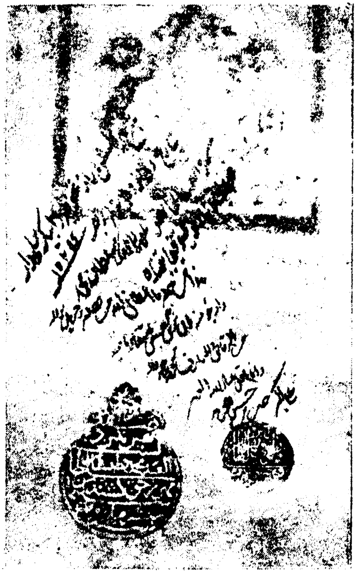
"ز مشرق تا مغرب گر امامست ۔۔۔ علی و آلِ او مارا تمامست

کتبہ العبد الخالص لمولاہ سلطان محمد قطب شاہ زاد توفیقہٗ فیما یتمناہ بتاریخ اوایل شہر رجب المرجب سنہ اربع وعشرین اعنی بعد الف من الہجریۃ النبویہ فی دارالسلطنۃ حیدآباد حرس اللہ عن الاضداد"

میرزا بیگ سلحدار[1] نے بادشاہ کو "شرح گلشن راز" کا ایک نسخہ بطور تحفہ عنایت کیا تھا اور اس کے سرورق پر سلطان محمد نے ایک تحریر لکھی تھی جس کا چربہ دوسرے صفحہ پر درج ہے۔

---

[1] یہ وہی مرزا بیگ فندرسکی ہے جس کا ذکر اس کتاب کے صفحہ ۱۳۰ پر گذر چکا ہے اور جس کا بھتیجا مرزا حمزہ میر صاحب کے فرزند مجد الدین کا داماد تھا۔



بادشاہ کی فرمائش پر رسالہ مقداریہ کی تالیف

بادشاہ کے علمی شغف کے ثبوت کئی اور طرح سے بھی دستیاب ہوتے ہیں مثلاً خود میر صاحب کے علم و فضل سے استفادہ کرنے کے لئے اس نے ان سے خواہش کی کہ اوزان اور پیمانوں کے متعلق شرع شریف کے مطابق معلومات فراہم کریں چنانچہ میر صاحب نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"چنیں گوید راقم ایں حروف عبد مامور محمد مومن بن علی الحسینی عفی عنہما کہ چون قدر و مقدار وزنہا و پیمانہا دانستنی است وجہت رعایت بعضے از امور شرعیہ و بعضی

اعمالِ طبیہ دانستن آنہا ضرور است بنا برایں دریں باب چند کلمہ کہ مناسب حال و مقتضی ضیق مجال بودہ باشد مرقوم می گردد بحکم واشارۂ واجب الاطاعۂ اعلیحضرت اشرف اقدس ارفع شاہی خلایق پناہی سکندر سپاہی سلیمان جاہی موردِ فیوضاتِ نامتناہی مشمولِ عنایتِ بے غایتِ الٰہی ؎

محمد قطب شاہ آں شہریارِ عادلِ کامل — کہ منت از وجودش بر ہمہ خلق است یزداں را

فلک بر گردِ قطبِ خویش می گردد بصد نازش — باین نسبت کہ ہم نامست ایں قطب جہانباں را

زہے قطبِ فلک قدرے کہ گردوں باہمہ دیدہ — گرانمایہ دُرے چوں آں نہ دید بحر امکاں را

جمالِ باکمالش باد زیبِ زینتِ دوراں — نشانِ زیں دو گوہر تا بود مہ چرخ گرداں را

چنانچہ اس کتاب کا اصل نسخہ جو خود میر صاحب کا لکھا ہوا ہے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے اور سلطان محمد قطب شاہ نے اس پر اپنی جو مہریں اور دستخط ثبت کئے ہیں ان کے عکس اس کتاب میں شریک ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ میر صاحب کے علم و فضل کی کتنی قدر اور احترام کرتا اور ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کو "نسخہ متبرکہ" خیال کرتا تھا۔

نفیس و نایاب کتابوں کی فراہمی

خود کتابیں لکھ کر دینے کے علاوہ میر صاحب نے بادشاہ کے ذوق علم و فضل کی ترقی اور وسعت مطالعہ کی خاطر اور بھی ذرائع اختیار کئے تھے۔ وہ سلطان محمد کے لئے دور دور سے اچھی کتابوں کی نقلیں منگواتے تھے۔ میرزا بیگ کے تحفہ گلشن راز کا ذکر تو گذر چکا ہے مثال کے طور پر یہاں "کتاب کثیر المیامن" کا تذکرہ درج کیا جاتا ہے۔

کتاب کنیز المیامن کی پیشکشی اور اس کا ترجمہ

کنیز المیامن (عربی) کا ایک متبرک قدیم نسخہ مکہ معظمہ میں تھا جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ خود امام رضا علیہ السّلام کا لکھا ہوا ہے اور اس کو انھوں نے زید شہید ابن امام زین العابدین علیہم السلام کے فرزندزادوں کو عنایت کیا تھا۔ اس نسخہ کو خود میر صاحب کے ایک ہموطن بزرگ مولانا مرزا محمد استرآبادی نے غالباً میر صاحب ہی کی فرمایش پر سلطان محمد قطب شاہ کے لئے نقل کرا کے مقابلہ اور تصحیح کی تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ اپنی زندگی ہی میں اس کو سلطان محمد کی بارگاہ میں پیش کریں لیکن یہ شرف ان کے بعد محرم ۱۰۲۹ھ میں مرزا اسمٰعیل کو نصیب ہوا جو ان کی اولاد میں تھے اور جنھوں نے میر صاحبؒ کے توسط سے یہ نسخہ سلطان محمد کی خدمت میں پیش کیا۔ خود میر صاحب نے بادشاہ کی اطلاع کے لئے اس نسخہ پر بطور کیفیت اپنے قلم سے ایک تحریر لکھی تھی جو درج ذیل ہے:—

میر صاحبؒ کا دیباچہ

"این مجلد مبارک مشتمل است بر کتابِ مستطاب کہ نسخۂ آں کتاب بخطِ بسیار قدیم منسوب بخطِ مبارکِ حضرت امام الجن و الانس امام ثامن ضامن امام رضا علیہ افضل التحیہ والثنا در مکہ معظمہ زادہ اللہ شرفاً و تعظیماً یافتہ شدہ۔ وچوں آں نسخۂ شریفہ بعضے اماراتِ صحت آیات داشتہ کہ موجبِ ظنِ صدقِ نسبت مذکورہ تواند بود حضرت مغفرت ایاب عمدۂ علمائے متورعین و زبدۂ کاملین متوطنین آں بلدامین مولانا میرزا محمد استرآبادی نورمرقدہٗ بعد از اطلاع بر آں نسخۂ مبارکہ درمقامِ انتساخ و استکتاب از آں شدہ این نسخۂ جدید را از آں نسخۂ قدیمہ نویسانیدہ خود متوجہ مقابلہ و تصحیح آں شدہ و آں چہ در آخر آں نسخۂ قدیمہ بودہ کہ دلالت

برنسبتِ آں خط با مام ہمام علیہ افضل السلام داشتہ کاتبِ ایں کتاب جدید آں را نیز بہماں وجہ نوشتہ و بر پشتِ آں نسخۂ قدیمہ چند سطرے مرقوم بود کہ آنہا دلالت بریں داشتہ کہ آں نسخہ را حضرت امام بعضی از فرزندزادہاے زید شہید کہ فرزند حضرت امام ہمام زین العابدین علیہ افضل السلام باشند بخشیدہ نام مبارک خود بجہت حجت بر آخر آں سطور نوشتہ اند حضرت مغفرت ایاب عمدۃ الفقہا مشار الیہ رحمۃ اللہ تعالےٰ بجہتِ زیادتی اعتماد بخطِ شریف خود بر ظہر ہمیں نسخۂ جدید آں مسطور را نوشتہ بعد از ملاحظۂ آں بعد از ورقے کہ ما بعد ایں صفحہ است مضمونِ نوشتۂ حضرتِ امام موافق آنچہ مذکور شد وضوح می یابد۔ و آں چند سطر کہ در بابِ مذکور اشارہ شد کہ ما بعد ورق مقابل صفحہ مرقوم است خطِ مغفرت ایاب مشار الیہ است۔ چوں نفاستِ نسخۂ مذکورہ بنا بر بعضے احوالِ مسطورہ بر فاضل مرحوم ظہور یافتہ بود بنا بر نسبتِ اخلاص و دعاگوی قدیم خواستہ بودند کہ تحفۂ کتابخانۂ مبارکۂ بندگانِ عالی حضرت آسماں رفعت مرکزِ دایرۂ جاہ و جلال محیطِ بسیطِ فیض و کمال مہرِ سپہرِ بختیاری قطبِ فلکِ شہریاری ابو الفضایل و المعالی سلطان محمد قطب شاہ ایدت ایام دولتہ الی یوم القیام گردانند چوں اتفاق نیفتاد از نجل سعید مرحوم مشار الیہ میرزا اسمٰعیل بتاریخ محرم الحرام سنہ ۲۹ھ بنظرِ مبارک اقدس مشرف شد و نمق ذالک اخلص الداعین لدولتہ القاہرہ العبد الجانی محمد مومن الحسینی عفی عنہ"

جب یہ کتاب سلطان محمد قطب شاہ کی نظر سے گذری تو اس نے میر صاحب کے ایک شاگرد محمد الشہیر بہ شاہ قاضی کو غالباً میر صاحب ہی کی رائے سے حکم دیا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ کریں چنانچہ شاہ قاضی نے اس کا ترجمہ کیا اور اصل کتاب سے قبل اپنے استاد میر محمد مومن کی اس تحریر کو جو اوپر نقل کی گئی ہے دیباچہ کے طور پر شریک کیا ہے۔

شاگرد کی عقیدت مندی

اس کتاب میں شاہ قاضی نے میر صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ان سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کے تلامذہ ان کو کس انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شاہ قاضی لکھتے ہیں:—

"حضرت سلطان المتالہین، و برہان المتفقہین، استاد البشر، العقل الحادی عشر من الیہ فی المعقول اسمانی و فی المنقول استاذی سید المحققین الامیر محمد مومن الاسترآبادی لازال سحاب افضالہ ماطرۃ علینا و وجوہ مراحمہ ناظرہ ...... و بعد از تبرک و تیمن بنقل صورت خط شریف حضرت استادی خلد ظلال افضالہ در ظہر آن نسخہ مبارکہ نگاشتہ در سلک ساختہ اند در ترجمہ کتاب شروع می نماید۔"

میر صاحب کے یہ شاگرد کس پایہ کے بزرگ تھے اس کا اندازہ صرف اُن کے اس قطعہ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے جو اس کتاب کے آغاز میں سلطان محمد قطب شاہ کے ترجمہ کرنے کے حکم کے ذکر میں لکھا گیا ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:—

خدیو دہر محمد کہ از خدا است موید	ظہیر ملت احمد امیر ملک ستانی
شہ سریر ایالت مہ سپہر جلالت	بدست و تیغ عدالت گرفتہ ملک کیانی

فلک کمینہ غلامش جہاں ہمیشہ بکامش　　　قضا نوشتہ بنامش ریاست دوجہانی

کاتب عرب شیرازی

اس کتاب کا ایک نفیس نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے جس کو مشہور قطب شاہی کاتب محمد مومن عرب بن شرف الدین حسن شیرازی نے ذالحجہ ۱۰۲۹ھ میں لکھا تھا۔ چنانچہ اس کے آخر میں عرب شیرازی نے لکھا ہے :۔

تمام شد این کتاب مبارک در تاریخ سلخ ذالحجہ الحرام ۱۰۲۹ھ در دار السلطنتہ حیدرآباد لازالت فی ظل دولت اعلحضرت والیہا مصونعتہ عن کل شروف و برسم خزانہ کتب اعلیحضرت انشامرتبت السلطان العادل الکامل افتخار السلاطین فی الزمان، و اشرف الخواقین فی الدوراں السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان خلیفتہ امن و امان ابو المظفر ابو المنصور سلطان محمد قطب شاہ..........

کتبہ العبد الداعی خدمہ باب العالی محمد مومن الشہیر بہ عرب بن شرف الدین حسن شیرازی"۔

اس تحریر سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اس عہد میں پیشوائے سلطنت میر محمد مومن کے علاوہ شاہی کاتب عرب شیرازی کا نام بھی محمد مومن تھا۔ دوسری بات یہ کہ اصل عربی کتاب محرم ۱۰۲۹ھ میں بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوی بادشاہ نے اس کا مطالعہ کیا اور مطالعہ کے بعد شاہ قاضی کو حکم دیا کہ فارسی میں ترجمہ کرے اور شاہ قاضی نے اتنی ضخیم کتاب کا اس قدر جلد ترجمہ کر دیا کہ ایک سال کے اندر ہی یعنے ذیحجہ ۱۰۲۹ھ تک کاتب نے اس کا نفیس نسخہ بھی تیار کر دیا۔ عہد حاضر میں بھی اس مستعدی اور توجہ سے شاید ہی کام ہو سکے۔ اس سے میر محمد مومن کی دلچسپی، ان کے

شاگرد کی لیاقت اور کاتب کی محنت سب کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ایک اور شاگرد علمی فیض رسانی اور شاگردوں کے ذکر میں علامہ شیخ محمد ابن خاتون کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ ان کا ذکر اس کتاب کے صفحہ ۱۲۸ پر بھی گذر چکا ہے۔ یہ بہت بڑے عالم و فاضل اور مجتہد وقت تھے اور صحیح معنوں میں میر صاحب کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ میر محمد مومن کے کسی شاگرد نے وہ رتبہ اور اعزاز نہیں حاصل کیا جو شیخ محمد ابن خاتون کو نصیب ہوا۔ وہ بھی میر صاحب ہی کی طرح آخر کار پیشوائے سلطنت بنائے گئے اور اپنے استاد اور محسن کی مانند دنیوی عروج کے ساتھ ساتھ ان کو بھی علمی اور روحانی عظمت حاصل ہوی۔

علامہ ابن خاتون کے کارہائے نمایاں اس قابل ہیں کہ ان پر بھی ان کے استاد میر محمد مومن کی حیات کی طرح ایک جداگانہ اور مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اور اگر راقم الحروف کو موقع ملے تو انشاء اللہ کسی وقت اس کی بھی تکمیل ہوجائے گی۔ اس لئے یہاں ان کی نسبت تفصیل سے نہیں لکھا جاتا۔ صرف اس امر کا اظہار کافی ہے کہ چونکہ ابن خاتون کو محمد قلی اور سلطان محمد جیسے عظیم الشان بادشاہوں کا زمانہ نصیب نہ ہوا اس لئے وہ سلطان عبداللہ کے عہد حکومت میں سیاسی کشمکشوں اور سازشوں میں گرفتار رہے اور ان کا زیادہ وقت مغلوں کے ساتھ امن و صلح کی سلسلہ جنبانیوں میں بسر ہوا۔ باوجود سالہاسال کی پیشوائی، وکالت مطلق اور اثر و اقتدار کے ان کو وہ دماغی سکون اور روحانی کیف حاصل نہ ہوسکا جو ان کے پیشرو اور استاد میر محمد مومن کو نصیب ہوا تھا۔ دربار میں ہمیشہ ان کو مخالفوں سے سابقہ رہا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ میں میر صاحب سے زیادہ دنیوی خواہشیں موجزن تھیں۔

اور وہ فضا کی خرابی اور بادشاہ عبداللہ کی متلون مزاجی کے باعث تنازع للبقا کے لئے مجبور ہو جاتے تھے۔ تاریخ حدیقتہ السلاطین ان کی ان ہی ذہنی کاوشوں اور مدبرانہ مساعی کی آئینہ دار ہے۔ اور ان ہی کے حکم سے ان کے مسلک کی تائید میں لکھی گئی ہے۔

علامہ شیخ محمد ابن خاتون اصل میں بہاءالدین عاملی کے شاگرد تھے لیکن جب سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آئے تو میر محمد مومن کے تبحر علمی کو دیکھ کر ان سے بھی بعض علوم میں تلمذ حاصل کیا۔ اور بقول صاحب "محبوب الزمن":—

"خود ملا مدعی تھا کہ میں آپ کا شاگرد ہوں" صفحہ ۹۹۵—

لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ملا ابن خاتون نے میر صاحب کی شاگردی کا کس موقعہ پر اعتراف کیا تھا۔ البتہ حدایق السلاطین میں علی ابن طیفور بسطامی نے لکھا ہے کہ:—

"شیخ ماہر در اکثر فنون شیخ محمد خاتون کہ در بعض مطالب علوم تلمذ جناب میر می نمود"[1]

میر صاحب کے شاگرد ہونے کے علاوہ شیخ محمد ان کے معتقد اور پیرو بھی تھے چنانچہ ان کی وفات پر انھوں نے جو مرثیے فارسی اور عربی میں لکھے ہیں ان سے ان کا اعتقاد ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا ذکر میر صاحب کی وفات کے بیان میں کیا جائے گا۔

میر صاحب کی پیروی کرنے کے ثبوتوں سے تو تاریخ حدیقتہ السلاطین بھری پڑی ہے

---

[1] حدایق ورق ۱۸۸ ا—

شیخ محمد کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ حیدرآباد میں لوگ ان کو میر محمد مومن کا صحیح جانشین سمجھیں۔ اسی لئے خدمت وکالت مطلق کے ساتھ علمی و مذہبی شغف برابر جاری رکھا۔ اور جو جو اعزاز میر صاحب کو نصیب تھے ان کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ صرف اس ایک واقعہ سے اس کا اچھا ثبوت مل جاتا ہے کہ علامہ ابن خاتون نے غالباً بڑی کوشش کے بعد اس امر کی اجازت حاصل کرلی کہ میر صاحب کی طرح پالکی میں سوار ہوکر دولت خانۂ شاہی میں داخل ہوسکیں۔ حالانکہ میر صاحب کے بعد کسی پیشوا کو یہ عزت نصیب نہ ہوی۔ شاہ محمد جو پیشوا ہونے کے علاوہ سلطان عبداللہ کا قریب ترین عزیز اور بزرگ تھا وہ بھی اس اعزاز سے محروم رکھا گیا تھا۔ لیکن علامہ ابن خاتون نے اپنے استاد کی اس سنت پر عمل پیرا ہونے میں کامیابی حاصل کرلی اور بادشاہ کو رضامند ہونا پڑا۔ چنانچہ ملا نظام الدین احمد نے لکھا ہے۔

”در رضائے اعلیٰ شدہ کہ نواب علامی فہامی (ابن خاتون) بر نسبت مغفرت پناہ میر محمد مومن سوار پالکی شدہ بہ دولت خانۂ گیتی نشانہ آمد و رفت نمایند۔“

حدیقۃ السلاطین وقائع ۱۰۴۶ھ۔

مذہبی اصلاح

جس طرح محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں میر محمد مومن نے مذہب کی ترویج اور بادشاہ کو مذہبی امور کی طرف متوجہ کرنے کی خاص کوشش کی تھی اسی طرح سلطان محمد کے عہد میں بھی وہ مذہبی معاملات سے بے خبر نہیں رہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے دوسرے حصہ (صفحات ۴۲ تا ۴۶) میں لکھا گیا ہے۔ محمد قلی کی تماشہ پسند طبیعت کو پیش نظر رکھ کر اس کے دور میں ماہ محرم اور ربیع الاول میں بعض ایسے مراسم جاری کئے گئے جن کی وجہ سے مذہب کی تبلیغ میں کافی کامیابی حاصل ہوی۔ لیکن عہد سلطان محمد میں ان مراسم کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ کیونکہ سلطان محمد اپنے

یہ چچا کی طرح تماشہ پسند اور رنگیلا بادشاہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ اس کے بالکل برخلاف ایک زاہد مرتاض اور عالم باعمل تھا۔ اسلئے میر محمد مومن کو موقع مل گیا کہ ان تمام بدعتوں اور خرافات کو دور کر دیا جائے جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً ربیع الاول میں ایک ہزار کلاونت رقاص صفۂ شاہی کے آگے رقص کرنے پر مامور تھے۔ رنڈیوں کے طائفے ہنگامۂ عیش ونشاط گرم کرتے' بازیگر اور بھانڈ طرح طرح کی نقالی اور مسخرہ پن کرتے' غرض ہر قسم کی عیاشی اور بدنمائی مذہب کی آڑ میں جاری ہو گئی تھی جس کی تفصیل کے لئے حدیقۃ السلاطین کے صفحات ۵۲ تا ۵۴ کا مطالعہ کافی ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں سلطان محمد کے عہد میں کیونکر جاری رہتیں۔ چنانچہ میر محمد مومن نے موقع کو غنیمت جان کر ان سب بدعتوں کو موقوف کرا دیا۔ اور جو رقم ان مراسم میں صرف ہوتی تھی وہ عالموں' اور بزرگوں میں تقسیم ہونے لگی البتہ چند بار عوام کو کھانا کھلایا جاتا جس کے لئے ایک ہزار ہون کا خرچ منظور کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کو نظام الدین احمد نے حسب ذیل الفاظ میں درج کیا ہے:۔

"مستور نماند کہ در زمان سلطنت ...... سلطان محمد قطب شاہ ..... ہنربانی وسوہ مولود حضرت سید اولاد آدم ..... موقوف ومتروک بود وخلائق ازیں عیش وعشرت مہجور ومحروم بودند ووجہ اخراجات آں را بعلما وصلحا واتقیا قسمت می نمودند۔ وبخوان سالار وچاشنی گراں امر مطاع عز صدور می یافت کہ در ماہ مبارک مولود چند نوبت سفرۂ عام بانواع اطعمہ واشربہ وجمیع تکلفات ماکولات واغذیہ گستردہ سایر طبقات اسلام را ازاں مایدہ محفوظ وملذذ دارند۔ مقرر بود کہ خرچ سفرۂ ہزار ہون بشود"۔ ف۵

پانچواں حصّہ

خانگی زِندگی

تاہل میر محمد مومن کی خانگی زندگی سے متعلق باوجود تلاش وجستجو کے زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حیدرآباد ہی میں شادی کی تھی۔ محبوب الزمن میں لکھا ہے :-

"آپ نے دکن میں شادی کر لی تھی"[1]

لیکن اس امر کا پتہ نہ چل سکا کہ کب اور کس کی دختر سے۔ افسوس ہے کہ صاحب محبوب الزمن نے اس بیان کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بیان صحیح ہوگا۔ کیونکہ محبوب الزمن میں میر صاحب کے جو حالات درج ہیں ان میں سے زیادہ تر واقعات کی تصدیق قدیم تاریخوں سے ہوتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ میر صاحب اوائل عمر میں مخالفین کے اندیشوں اور پریشانی کے عالم میں ایران سے ہجرت کر گئے تھے۔ اور مقامات مقدسہ میں دو تین سال قیام کر کے حیدرآباد کا رخ کیا تھا۔ ان حالات کے تحت وہ مجرد ہی حیدرآباد آئے ہوں گے۔ اور یہاں آنے کے تین چار سال بعد یعنی تقریباً ۱۰۹۵ھ میں انھوں نے شادی کی تھی۔ اس کا ثبوت اس طرح بہم پہنچتا ہے کہ ان کے اکلوتے فرزند میر مجدالدین محمد حیدرآباد ہی میں پیدا ہوئے۔ اور یہیں ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر کم از کم چالیس سال کی تھی۔ کیونکہ ان کے انتقال سے کئی سال قبل ان کی دختر کی شادی مرزا حمزہ استرآبادی سے ہو چکی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر شادی کے وقت میر مجدالدین محمد کی دختر کی عمر کم سے کم

---

[1] محبوب الزمن حصہ دوم صفحہ ۹۹۵۔

پندرہ سال کی بھی ہو تو مجد الدین کی پیدائش ۱۰۰۰ھ سے قبل ہی کی کسی تاریخ میں قرار پاتی ہے۔ اس طرح یہ یقینی ہے کہ مرزا حمزہ کے دادا خسر یعنے میر محمد مومن ۱۰۰۰ھ سے پہلے ہی غالباً ۹۹۵ھ کے قریب متاہل ہو گئے تھے۔

فرزند میر صاحب کے ایک ہی فرزند میر مجد الدین محمد تھے[1] جن کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم اور محاسن اخلاق کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اور جو بعض خوبیوں میں اپنے والد سے بھی زیادہ نیک نام تھے۔ علم و فضل کے لحاظ سے وہ اپنے معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے کلام اور قطعات تاریخی وغیرہ سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ اور حدائق السلاطین میں تو لکھا ہے کہ:۔

"در علوم شرعیہ و فنون ادبیہ از اقران و امثال گوے مسابقت می ربود[2]"

مجد الدین کو شفقت و سخاوت اور مروت و وفا کے جذبات اگرچہ اپنے والد سے ورثہ میں ملے ہوں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوبیاں ان میں اتنی کثرت سے جمع ہو گئی تھیں کہ وہ اس لحاظ سے اپنے والد سے زیادہ نیک نام تھے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز ان کی آنکھ میں نہ جچتی تھی۔ دنیوی اغراض اور حرص و ہوس کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کوئی منصب یا عہدہ قبول نہیں کیا۔ ان کی نسبت علی ابن طیفور لکھتا ہے:۔

---

[1] حدائق السلاطین میں میر صاحب کی وفات کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔ "جناب نقابت مآب را یک پسر والا گہر بود۔ میر مجد الدین محمد نام" ورق ۱۹۱ ا۔

[2] حدائق ورق ۱۹۱ ا۔

"دنیا و مافیہاش در نظر ہمتش بس حقیر می نمود"[1]

دنیا داری اور سرکاری منصب پر فائز ہونے کی جگہ مجدالدین محمد نے خود کو خلق اللہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ اکثر درویشوں اور مسافروں کی صحبت میں گزارتے تھے۔ اور ان کے آرام و آسائش کے لئے انتہائی کوشش کرتے۔ چنانچہ لکھا ہے :-

و اکثر بسر وقت درویشاں و مسافراں می رسید۔ و در رعایت ایشاں باقصی الغایت می کوشید[2]

اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے کہ جس کی طبیعت میں ہمدردی اور بذل وعطا کا مادہ فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہو۔ چنانچہ اسی مورخ نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ :-

"بوفور جود و سخا و شفقت و وفا شہرۂ شہر دکن بود" (ورق ۱۹۱ ا)

ممکن ہے کہ جود و سخا کی اس رغبت میں مجدالدین پر اپنے خسر یولچی بیگ کا بھی کچھ اثر پڑا ہو۔ کیونکہ یولچی بیگ بھی اپنی سخاوت میں بہت مشہور تھے اور ملا نظام الدین احمد نے اپنی تاریخ حدیقۃ السلاطین میں ان کو اکثر "سخاوت پناہ" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

میر صاحب کے سمدھی

اس واقعہ کا ثبوت کہ یولچی بیگ مجدالدین کے خسر اور میر صاحب کے سمدھی تھے ایک محضر سے ملتا ہے جو خود مجدالدین کے ایک پوتے سید محمد بن میر محمد شفیع نے سنہ ۱۱۴۰ھ میں لکھا تھا۔ اس میں لکھا ہے[3] :-

---

[1، 2] حدائق ورق ۱۹۱ ا ۔ [3] یہ محضر مولوی میر عباس علی صاحب نبیرہ میر محمد مومن کے یہاں اب بھی محفوظ ہے۔

"ایں سائل از اولاد قریبہ چنانچہ نبیرہ زادہ حقائے اسعد الشرفا امجد النجبا مولانا میر محمد مومن مرحوم پیشوائے سلطان محمد قلی قطب الملک و از احفاد حقیقۃ نواسہ زادۂ یولچی بیگ معروف سپہ سالار قطب الملک مغفور مذکور است ...... تحریر فی التاریخ ہفتم شعبان ۱۱۴۲ھ

اس محضر پر حسب ذیل اصحاب کی گواہیاں اور مہریں بھی ثبت ہیں :-

حاجی منصور	محمد کاظم	مرزا مہدی خاں صفوی
فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ غازی	فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ	مہر ۱۱۳۱ھ
مہر ۱۱۲۵ھ	مہر ۱۱۲۵ھ	

اس طرح سید محمد ابن میر محمد شفیع ابن میر مجد الدین محمد جب خود کو یولچی بیگ کا نواسہ زادہ کہتے ہیں تو ظاہر ہوا کہ میر محمد شفیع یولچی بیگ کے نواسے ہوئے اور مجد الدین محمد داماد۔

فرزند کی وفات

افسوس ہے کہ مجد الدین محمد بہت جلد انتقال کر گئے۔ غالباً چالیس سال کی عمر بھی نہیں پائی تھی۔ حدایق میں لکھا ہے کہ وہ دنیا کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور خود کہتے تھے کہ :-

دنیا بہ نظر مرا چو کاہیست ۔ کافتادہ خسے بہ روئے آہیست

اگر وہ اور زندہ رہتے تو یقین ہے کہ ان کے باعظمت والد کے بعد ان کو قطب شاہی سلطنت میں کوئی بڑا عہدہ دیا جاتا۔ لیکن وہ تو دنیا سے کوئی تعلق ہی پیدا نہ کرنا چاہتے تھے شاید اسی لئے اپنے بوڑھے والد کی زندگی ہی میں اس کو خیرباد کہدیا اور چھوٹے چھوٹے بچوں اور ضعیف باپ کو داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی بے وقت وفات کا میر محمد مومن پر اتنا اثر پڑا کہ ان کے چہلم تک

یہ بھی اُن سے جا ملے۔

سچ تو یہ ہے کہ اِس جواں مرگ کے سانحہ میر محمد مومن کے گھر کی رونق اور اقبال بھی دفن ہو گیا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو شاید اِس بوڑھے پیشوائے سلطنت کی ذات سے سرزمین دکن ابھی اور فیضیاب ہوتی اور خود ان کا خاندان اس قدر جلد تاریخ کے صفحات سے محو نہ ہونے پاتا۔

علی ابن طیفور نے لکھا ہے کہ :۔

"میر مجد الدین مذکور پیش از والد مغفور بچہل روز جہانِ فانی را وداع نمودہ"

(حدائق ورق ۱۹۱ ل)

اور جیسا کہ میر صاحب کی وفات کے ذکر میں معلوم ہو گا کہ میر محمد مومن نے بروز دوشنبہ دوسری جمادی الاول ۱۰۳۴ھ کو انتقال کیا۔ اس حساب سے میر مجد الدین محمد کی وفات کی تاریخ جمعرات ۲۲ ربیع الاول ۱۰۳۴ھ قرار پاتی ہے۔

قطعہ تاریخ حدائق السلاطین میں میرزا احسن اسد خانی کا ایک قطعہ تاریخ نقل کیا ہے۔ لکھا ہے۔

"سالک مسالک سخندانی میرزا احسن اسد خانی این قطعۂ تاریخ وفات او فرمودہ

مجد دیں آنکہ نزد اہل خرد | دو جہاں سایہ بود او خورشید
بہ گدائے اجل شب جمعہ | گوہر عمر جاوداں بخشید
بہر تاریخ او سپہر بریں | داغ بر دل نہاد و آہ کشید

فرزند کا کلام مجد الدین کو اپنے والد کی طرح شعر و سخن کا بھی بڑا اچھا ذوق تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے لیکن دیوان مرتب نہیں ہونے پایا تھا۔

البتہ اُن کے بعد ان کے فرزند سید محمد جعفر نے ان کے متفرق اشعار کو جمع کیا اور اس پر ایک اعلیٰ پایہ دیباچہ لکھکر دیوان مرتب کر دیا تھا۔ علی ابن طیفور لکھتا ہے:۔

"پسر او سید حمید و سیر فضیلت گستر سید جعفر بعد از فوت والد عالی قدر اشعار متفرقہ او را جمع ساختہ و دیباچہ منشیانہ بران نگاشتہ"

غالباً اسی دیوان سے اس مورخ نے اپنی کتاب حدایق السلاطین میں مجد الدین محمد کے چند اشعار[۱] نقل کئے ہیں جو یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

ندید آسودگی جان و نشد خرسند ہرگز دل مرا تا بر جگر زان غمزہ زخم کارئے ماند
مجو بیہودہ اے دل یاری از یارے کہ در عہدش مروت بے مروت شد زیاری یارئے ماند

ہر جا کہ حکم غمزۂ قتالہ می رود این جان خوں گرفتہ ز دنبالہ می رود
بے لعل نور چشم ترا شک فشردہ ام الماس پارہاست کہ چوں ژالہ می رود
اے مجد دیں خموش کہ گر دم بر آوری ناموس عشق از اثر نالہ می رود
صرف شد عمر بنا کامیم و شکر خدا در بعیش و خوشی ولہو ولعب متہم
لم فعل فیئہ من ہو بحد لا خیہ داند آنکس کہ سخن سنج بود لم لم
با طلعت تو مہر ز من کردی اقتباس دور از رخت چو دیدۂ بے نور بودہ ام

---

[۱] علی ابن طیفور نے لکھا ہے کہ:۔ "آں سید عالی مقدار اشعار بلاغت شعار بسیار دارد از انجملہ انچہ حاضر بود بریں اوراق ثبت نمود" ورق ۱۹۱ ا۔

من آں بے اعتبارِ روزگارم — کہ باشد اعتبارِ دہر عارم
خداوندا اگر گردوں نداند — کہ من نورِ دو چشمِ اعتبارم
عیارِ مرد را ہم مرد داند — چہ داند دہر دوں پرورِ عیارم
ز بہرِ توتیائے چشمِ خورشید — بگردوں می برد عیسیٰ غبارم

یک نظر صورتِ خوبِ تو تماشا کردیم — عقلِ کل را بتماشائے تو شیدا کردیم
دل و دیں رونمائے خط و خالے دادیم — ہوش بے حوصلہ را محوِ تماشا کردیم

رخت گر ایں قدر زیبا نباشد — مرا حال ایں چنیں رسوا نباشد
مرا سودائی عشقِ تو گویند — نمی گویند چیزے تا نباشد

بدہر غیرِ تو شاہِ دگر نمی دانم — بجز درِ تو پناہِ دگر نمی دانم
قسم بہ مصحفِ رویت کہ زیرِ نُہ طارم — چو ماہ روئے تو ماہ دگر نمی دانم
جز آں نگاہ کہ افگندم از ازل بہ رخت — بدیدنت کہ نگاہِ دگر نمی دانم

یکبار بسویم نگری گر گنہے نیست — ہر چند کسے راز تو تابِ نگہے نیست
زاں زلفِ سیہ کار و ازاں طرۂ طرار — کس نیست کہ آشفتہ سر روز و شبے نیست

خیالِ وصلِ تو بادا حرامم اگر یک لحظہ بی یادِ تو باشم

چو بکشائی تو سیم اندام اندام نماند در دلِ آرام بارام
دو عالم کشتۂ مفتونِ دو چشمت ندیدستم چو آں بادام بادام
شدم رسوائے دہر از صحبتِ دل بود ہم صحبتِ بدنام بدنام
ز گردوں کام خود ہرگز نجویم کرا دادہ است ایں خود کام خود کام
بگفتا از لبِ شیرینم امجد (اے مجد) چہ خواہی گفتمش دشنام دشنام

ز بلبل در چمن گر نالہائے زار می زیبد مرا مہرِ خموشی بر لبِ گفتار می زیبد
لبِ شوق از تکلم بستہ ام با ایں ہمہ مستی کہ در بزمِ محبت خامشی بسیار می زیبد

دلِ عاشق فرح از غم نداند نداند سوز از ماتم نداند
کسے را گفت شاید محرمِ عشق کہ خود را ہم بخود محرم نداند

بجز غم در جہاں خویشے ندارم انیسے جز دلِ ریشے ندارم
بدو کس می نیندیشم از آں رو بعالم در بد اندیشے ندارم

بگفتارِ تو جاں را آشنائی / ز رخسارت جہاں را روشنائی
خلایق در گمانِ دیگر افتند / بداں رخسارِ نیکو چوں برائی
تعالی اللہ چہ حسنست ایں کہ خوباں / پرستندت بہ عنوانِ خدائی

ہیچ مردے در جہاں ہمدرد نیست / ہر کہ او را درد نبود مرد نیست
سرخ روئے می نبیند زرد گوں / آنکہ از درویش روئے زرد نیست
گر تو مردی نفس را گردن بزن / گو زنست و زن حریفِ مرد نیست
من چساں گویم کہ فردم در جہاں / جز خدا در ہر دو عالم فرد نیست
مجد دیں در گرم رفتاریِ شوق / کمتر از خورشیدِ عالم گرد نیست

بلبل چو صبا گل بہ گریباں ہوس کرد / مرغ دلِ ما بود کہ آہنگ قفس کرد
اے رہروِ امید بیندیش کہ ما را / سرگشتۂ ایں بادیہ آوازِ جرس کرد
از داغ بود سوزِ دلِ اہلِ محبت / در کشورِ ما شعلہ نگہبانیِ خس کرد

عرضہ از بس بگلوئے نفسم می پیچد / عنقریبست نفس در قفسم می پیچد
ہمتم لب نکشاید بہ تمنائے مراد / کہ زباں در دہنِ ملتمسم می پیچد
ہوسم روئے ز مقصود جہاں پیچیدہ / ورنہ مقصود نہ رخ از ہوسم می پیچد

پر شدم بس کز خیال خوبروئے تازۂ — می تراود از خیالم گفتگوئے تازۂ
التفات خاص او نازم که از بس عام شد — آرزو ہر لحظه دارد آرزوئے تازۂ

شب تیرگی از بخت بدم وام کند — روز سیہم کار دو صد شام کند
با صد الم زمانه تہمت گر عیش — صد مرگ بہرزه زندگی نام کند

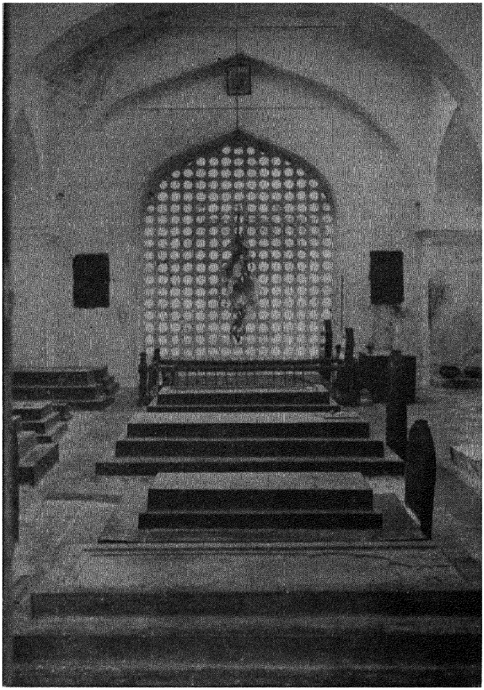
از مجد خلاف راستی عیب بود — در راستیش نه شک و نه ریب بود
صد بار اگر منقلبش ساز دہر — بے عیب چو برگردد و بے عیب بود

امجد[1] که دلش میل نکوئی دارد — خواہد که ہمه تخم نکوئی کارد
نسبت بہمه ہمیں گمانست اورا — کافر ہمه را بکیش خود پندارد

یہ سب اشعار صرف حدائق السلاطین سے نقل کئے گئے ہیں۔ اور ان کے لئے اس کتاب میں اتنی زیادہ جگہ صرف اس لئے دی گئی ہے کہ میر مجد الدین محمد کے حالات زندگی اور کلام کی اشاعت کا کوئی اور موقع نہیں۔ چونکہ وہ اپنے والد کی حیات ہی میں ختم ہو گئے اس لئے ان کا جو کچھ بھی تذکرہ لکھا جا سکتا ہے وہ دراصل حیات میر محمد مومن ہی کا ایک جزو ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ کلام ایک ایسی کتاب میں محفوظ ہے جس کا اس وقت صرف ایک ہی نسخہ موجود ہے اس لئے

---

[1] حدائق میں میر مجد الدین کا تخلص دو جگہ (دیکھو اسی کتاب کا صفحہ ۱۹۰) امجد لکھا ہے۔ غالباً کاتب نے مجد کو امجد لکھدیا ہے۔



میر مجد الدین محمدؒ کا مزار (واقع گنبد میر محمدؒ مومن)

اس کا منظرِ عام پر آجانا ضروری ہے تاکہ دستبرد ایام سے بچ جائے۔

خصوصیات کلام

میر مومن اور ان کے فرزند میر مجد الدین محمد کے کلام میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ موخر الذکر کے یہاں وہ پختگی اور ذوق کی پختہ کاری نہیں ہے جو میر مومن کے کلام میں نظر سے گذرتی ہے۔ اس کے برخلاف مجد الدین محمد کے یہاں طبیعت کی بے باکی اور جوانی کی ترنگ زیادہ نمودار ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مجد الدین عربی کے بہت بڑے فاضل تھے اور عربی کتب کے مطالعہ کے علاوہ عربی میں شعر بھی کہا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے ان منتخبہ اشعار میں بھی عربی مصرعے اور الفاظ نظر سے گذرتے ہیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے عربی میں قطعات تاریخی بھی لکھے تھے جن میں سے ایک کا ذکر حدیقۃ السلاطین میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کی پیدائش کے سلسلہ میں ملتا ہے جب کہ مصنف نے لکھا ہے:۔

"جناب میر مجد الدین محمد ولد میر محمد مومن رحمۃ اللہ این دو تاریخ در قطعہ عربی و فارسی فرمودہ اند۔ "قرۃ اعین الانسان" اول فتح و ظفر آخر رنج و الم است۔ و تاریخ فارسی را بطریق تعمیہ ادا فرمودہ اند" (ص)

مجد الدین کی قبر

چونکہ فرزند نے اپنے والد کی زندگی ہی میں وفات پائی اس لئے میر صاحب نے ان کو اس مقبرہ کے وسط میں دفن کرادیا جو غالباً خود انھوں نے اپنے لئے ایران کی طرز پر تعمیر کیا تھا۔ اس طرح جواں مرگ فرزند کو باپ کی جگہ مل گئی۔ اور جب

چالیس دن کے فصل سے خود میر صاحب نے انتقال کیا تو ان کو اس مسقف مقبرہ کے ایک گوشہ میں دفن کیا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان دونوں کی قبروں کے سرہانے جو پتھر کھڑے کئے گئے ہیں ان پر نہ صاحب مزار کا نام درج ہے اور نہ تاریخیں۔ جس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ میر صاحب کو اپنے فرزند کا کتبۂ مزار تیار کرانے کا موقعہ نہ ملا تھا اور فوت ہو گئے۔ اور ان کے بعد تعجب ہے کہ کسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔

دیگر مصروفیتیں

فرزند اور شاگردوں کی تدریس و تربیت اور ذاتی تصنیف و تالیف و مطالعہ کے علاوہ میر صاحب کے خانگی اوقات عبادت اور اوراد وظائف اور رفاہ خلق میں گذرتے تھے۔ اور جب کبھی انھیں سرکاری کاموں سے فرصت ملتی تھی وہ ان دیہات میں بھی جاکر قیام کرتے تھے جن میں انھوں نے مسجدیں اور تالاب بنوائے تھے اور جن کا ذکر تیسری فصل میں گذر چکا ہے۔ میر صاحب کے وسیع مطالعہ کا حال آئندہ باب "تصنیف و تالیف" میں درج ہے۔

رفاہ خلق کے کاموں میں میر صاحب کی ان دلچسپیوں کو خاص دخل ہوگا جو تسخیر اجنہ اور تعویذوں اور عملیات سے متعلق ان کو شروع سے حاصل تھیں۔ چنانچہ اس قسم کی متعدد روایتیں ملتی ہیں کہ کس طرح لوگ اس قسم کے امور میں میر صاحب کی باطنی قوتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چونکہ یہ ایک بڑا موضوع ہے اس لئے اس کتاب میں "تصرفات" کے عنوان کے تحت ایک جداگانہ حصہ میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

درس و تدریس

میر صاحب کی خانگی مصروفیتوں میں سب سے اہم مصروفیت درس و تدریس ہی نظر آتی ہے۔ ان کے شاگردوں محمد شاہ قاضی اور محمد ابن خاتون کا ذکر

اس کتاب کے صفحات ۱۵۱ تا ۱۵۳ اور ۱۵۵ پر گذر چکا ہے۔ افسوس ہے کہ دوسرے شاگردوں اور فیض یافتوں کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ البتہ حدائق السلاطین سے واضح طور پر یہ معلوم ہوا کہ اس زمانہ کے اکثر طلبا اور فضلا میر صاحب کی درسی مجلسوں میں حاضر رہ کر استفادہ کرتے تھے۔ اس تاریخ کے الفاظ ہیں:—

"جمعے از طلبا و فضلائے آں عصر در مجلس درس افادہ او حاضر شدہ مستفید می شدند"[1]

اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وفات تک ان کی یہ مصروفیتیں پابندی کے ساتھ جاری رہیں۔ لکھا ہے:—

"بہماں حال و منوال با وفور جاہ و جلال بود تا زمانے کہ متقاضی اجل در رسید"[2]

تاریخ گلزار آصفیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد

گوشہ نشینی و عبادت

اپنا زیادہ تر وقت گوشۂ تنہائی اور عبادت میں گذارا۔ سلطان محمد کی تخت نشینی کے موقع پر میر صاحب نے جو قصائد لکھے اُن کے تذکرہ کے بعد لکھتا ہے:—

" در طہارت و تقدس و عبادت الٰہی معہ تہجد گذاری و نماز اشراق و دیگر عبادات و اوراد و ادعیات شاقہ شبانہ روز مشغول باوجود شواغل دنیا داری سرمو تکاہل و

---

[1] حدائق السلاطین صفحہ ۱۸۷ ب —
[2] حدائق السلاطین صفحہ ۱۸۸ ا —

تساہل نمی نمود ۔ ومشہور تر است کہ آنجناب بعد جلوس و انتظام امور سلطنت پادشاہ ممدوح تا عہد سلطنت سلطان عبداللہ قطب شاہ در عالم انزوا بعبادت الٰہی مصروف بودہ ایام موعود بپایان رسانید و متوجہ معاملات دنیوی نگردید"[1]

اس عبارت کا ابتدائی حصہ صحیح ہے اور یہ جو بعد میں لکھا ہے کہ میر صاحب کی نسبت مشہور ہے کہ وہ آخر زمانہ میں بالکل خانہ نشین ہو گئے تھے اور دنیوی معاملات کی طرف توجہ نہ کرتے تھے قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ انھوں نے آخر تک پیشوائی کا کام انجام دیا چنانچہ حسین شیرازی کو اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر ہی شہزادہ عبداللہ کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس دور میں وہ عمر کے تقاضہ سے دنیوی امور کے مقابلہ میں دینی معاملات کی طرف زیادہ متوجہ تھے ۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ انھوں نے دنیوی معاملات کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں کی ۔

علالت میر صاحب کی علالت یا مرض الموت سے متعلق قدیم تاریخیں بالکل ساکت ہیں ۔ البتہ محبوب الزمن میں عبدالجبار خاں صوفی نے لکھا ہے کہ :-

"میر صاحب موصوف بعارضہ بخار سرسام ۱۰۳۴ھ میں اس عالم خاک سے عالم پاک کی طرف رحلت گزیں ہوئے" صفحہ ۹۹۵ ۔

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ صاحب محبوب الزمن کو اس عارضہ کی اطلاع کس ماخذ سے ملی ۔ اس بیان میں انھوں نے سنہ وفات بھی دیدیا ہے لیکن ماہ و تاریخ درج نہیں کیا۔ اس بارے میں مولف کتاب ہذا نے

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۶۰۸

تاریخ وفات جب مزید تحقیق کرنی چاہی اور دوسری تاریخوں پر نظر ڈالی تو ہر جگہ ایک پریشان کن اختلاف نظر آیا۔

مآثر دکن میں مولوی سیّد علی اصغر صاحب بلگرامی نے دائرہ میر مومن کے تذکرہ میں میر صاحب کا سنہ وفات ۱۰۳۵ھ لکھا ہے اور مہینہ کا ذکر نہیں کیا[1]۔

عبدالجبار خاں صوفی نے محبوب الزمن حصہ دوم میں صفحہ ۹۹۵ پر ۱۰۳۴ھ اور صفحہ ۹۹۶ پر ۱۰۳۳ھ لکھا ہے۔

تاریخ گلزار آصفیہ میں میر صاحب کو عہد سلطان عبداللہ قطب شاہ تک زندہ دکھایا ہے[2]۔

تاریخ حدیقۃ العالم میں حدیقۃ السلاطین کا حوالہ دیدیا ہے کہ میر مومن صاحب نے سلطان محمد کے آخر عہد میں انتقال کیا[3]۔ اور خود حدیقۃ السلاطین کے الفاظ یہ ہیں :-

"در اواخر زمانہ خاقان علیئین مکان نواب علامی فہامی میر محمد مومن ...... بہ رحمت ایزدی پیوست ......[4]"

اس طرح یہ بات تو ہر طرح ثابت ہے کہ میر مومن نے سلطان محمد قطب شاہ سے پہلے (یعنی ۱۲ر ماہ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ سے قبل) انتقال کیا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ تاریخوں میں ان کو

---

[1] دیکھو مآثر دکن صفحہ ۳۲ — [2] دیکھو گلزار آصفیہ صفحات ۶۰۸ و ۶۱۵ —

[3] دیکھو حدیقۃ العالم مقالہ اول صفحہ ۳۰۲ —

[4] دیکھو صفحہ ۲۸ —

کس زمانہ تک بقیدِ حیات دکھایا گیا ہے۔

تاریخ عالم آرائے عباسی میں لکھا ہے:۔

"واکنوں کہ ایں صحیفہ تسوید می یابد و سنہ ہجری بخمس عشرین والف رسیدہ
در قید حیات است[1]"

حدیقۃ السلاطین کا مصنف نظام الدین احمد میر صاحب کا خاص معتقد اور ان کے شاگرد علامہ شیخ محمد ابن خاتون کا دست گرفتہ تھا اور جیسا کہ اس کتاب کے صفحات ۵۵ و ۵۶ میں لکھا گیا ہے کہ اس نے اپنی تاریخ انہی کی فرمایش پر لکھی تھی اس لئے اس کا بیان سب سے زیادہ مستند ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ خود میر مومن صاحب کی وفات کے وقت حیدرآباد میں موجود تھا اور اس کی تاریخ میر صاحب کے قریب ترین زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب عبداللہ قطب شاہ کی عمر آٹھ سال کی ہوئی (یعنی ۱۰۳۱ھ) تو مرزا شریف کا انتقال ہو گیا اور بادشاہ نے میر صاحب کی سفارش پر مرزا شریف کی جگہ خواجہ مظفر علی کا تقرر کیا[2]۔

اس کے بعد حدیقۃ السلاطین ہی میں صفحہ ۱۰۱ پر یہ لکھا ہے کہ خواجہ مظفر علی نے اس وقت انتقال کیا جب کہ شہزادہ عبداللہ دس سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ مظفر علی نے ۱۰۳۳ھ کے بعد انتقال کیا اور اس کے انتقال کے بعد بھی حضرت میر مومن زندہ تھے۔ کیونکہ اس مصنف نے

---

[1] عالم آرائے عباسی مطبوعہ ایران صفحہ ۱۵۹۔

[2] دیکھو حدیقۃ السلاطین ص۹۔ اور اصل عبارت خود اس کتاب کے صفحہ ۱۴۴ پر بھی درج ہے۔

آگے چلکر سلطان عبداللہ کی تخت نشینی کے بیان میں لکھا ہے کہ :-

"میر محمد رضائے استر آبادی را ...... بعد از خواجہ مظفر علی منصب دبیری بتوجہ نواب علامی مرتضائے ممالک اسلام مرحمت کردہ بودند"[1]

گویا مظفر علی کے انتقال (شوال ۱۰۳۳ھ) کے بعد سلطان محمد نے دبیر مملکت کے عہدہ پر میر صاحب ہی کی رائے سے میر محمد رضا کا تقرر کیا تھا۔

میر صاحب کی تاریخ وفات کے تعین میں اس وجہ سے بھی دقت ہوتی ہے کہ ان کا عرس ماہ شعبان میں ہوتا ہے۔ اور اگر یہ سمجھ لیں کہ اس مہینے میں وہ فوت ہوئے تھے تو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ شوال ۱۰۳۳ھ (تاریخ وفات خواجہ مظفر علی) اور جمادی الاول ۱۰۳۵ھ (تاریخ وفات سلطان محمد قطب شاہ) کے درمیان میں ماہ شعبان ایک ہی بار آتا ہے۔ یعنے شعبان ۱۰۳۴ھ۔

۱۰۳۴ھ کا ثبوت ایک اور ذریعہ سے بھی ملتا ہے۔ وہ یہ کہ علامہ شیخ محمد ابن خاتون نے میر مومن صاحب کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک عربی شعر عبدالجبار خاں صوفی نے محبوب الزمن میں نقل کیا ہے اور جس فارسی شعر میں اس نے تاریخ نکالی تھی وہ بھی۔ لیکن نہ معلوم کتابت کی وجہ سے یا خود مولف کے سہو سے تاریخ کے شعر کا دوسرا مصرعہ غلط نقل کر دیا گیا ہے اور اس کے نیچے ۱۰۳۳ھ بھی چھپا ہوا ہے۔ شعر یہ ہے :-

تاریخ رفتنش طلبیدم ز عالمی گفت بجواز رفتن عیسٰی باسماں
۱۰۳۳

[1] حدیقۃ ص۲۵

لیکن رفتن عیسیٰ بآسماں سے تو سنہ ۱۰۳۴ھ ہی نکلتا ہے ۔ اس شعر کا مصرع ثانی اصل میں یوں ہے ع

گفتا بجو ز رفتن عیسیٰ بآسماں

چنانچہ حدائق السلاطین میں[1] اسی طرح نقل کیا گیا ہے ۔ اور اس میں عربی شعر کو نقل کرتے وقت یہ عبارت لکھی ہے :۔

"و زبانِ حال آں ماہ وسال بایں بیت ناطق گشتہ

مضٰی و اعظم مفقود فجعت بھہ

من لانظیر لہ فی الناس یخلفہ"

ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ خود علی ابن طیفور نے میر صاحب کی تاریخ وفات ان الفاظ میں لکھی ہے :۔

"در آخر روز دوشنبہ دویم شہر جمادی الاول سنہ ہزار وسی و چہار دعوت حق را لبیک اجابت گفتہ متوجہ روضۂ رضواں گردید"[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے پیر کے دن آخر وقت بتاریخ ۲ ر جمادی الاول سنہ ۱۰۳۴ھ انتقال کیا ۔ اور غالباً یہی تاریخ صحیح ہے ۔ بعد کو لوگ جب صحیح ماہ و تاریخ بھول گئے تو ماہ شعبان میں عرس کرنے لگے ۔

او ۲ے حدائق ورق ۱۸۸ ا ۔

ید بیضا میں غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :۔

"در سنہ اربع وثلثین والف راہ عدم پیمود" [1]

غرض ۱۰۳۴ھ کے متعلق تو مختلف شہادتوں کی بنا پر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ میر صاحب نے اسی سنہ میں انتقال کیا۔ البتہ ماہ وتاریخ کی نسبت سوائے حدائق السلاطین کے کسی اور کتاب سے شہادت فراہم نہ ہوسکی ۔

تجہیز وتدفین میر صاحب کی تجہیز وتدفین کا ذکر سوائے محبوب الزمن کے کسی اور کتاب میں نظر سے نہیں گذرا ۔ محبوب الزمن میں لکھا ہے :۔

"حسب نصیحت میر مرحوم دائرہ میں مدفون کئے گئے ۔ پس ماندوں کا ارادہ تھا کہ میر کی لاش کربلائے معلی روانہ کریں ۔ مگر نصیحت کی وجہ سے سب نے اس ارادہ کو فسخ کیا میر نے دائرہ کو کربلائے معلی کا ایک قطعہ پر فضا بنا دیا تھا اسی وجہ سے یہیں دفن کرنے کی وصیت کی" صفحہ ۹۹۶ ۔

افسوس ہے کہ صاحب محبوب الزمن نے اپنے اس بیان کا بھی ماخذ نہیں لکھا ۔ میر صاحب کی وصیت کہ ان کو دائرہ میں دفن کیا جائے بالکل صحیح اور حق بجانب معلوم ہوتی ہے لیکن ان کے پسماندوں کے خیالات کا جو اظہار کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ دائرہ کی موجودگی میں کسی شخص کے دل میں یہ خیال گذر بھی نہیں سکتا تھا کہ صاحب دائرہ یعنے میر صاحب کی لاش کو کربلائے معلی

---

[1] قلمی نسخہ کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر صفحہ ۲۷۶ ۔

روانہ کیا جائے جب کہ خود دائرہ کو میر صاحب نے کربلا سے مٹی منگا کر اور وقف کر کے ایک بہترین جگہ بنا دیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ میر صاحب کے پسماندوں میں (جیسا کہ آئندہ ایک عنوان کے تحت معلوم ہوگا کہ) سوائے کمسن بچوں کے اور کوئی تھا ہی نہیں۔ اور ان بچوں کے دماغ میں ایسا خیال کیونکر آسکتا تھا؟

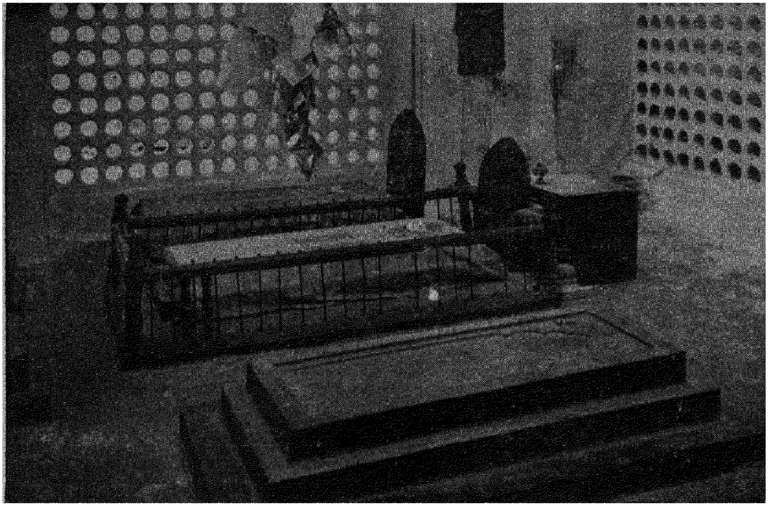
قبر اور چوکھنڈی

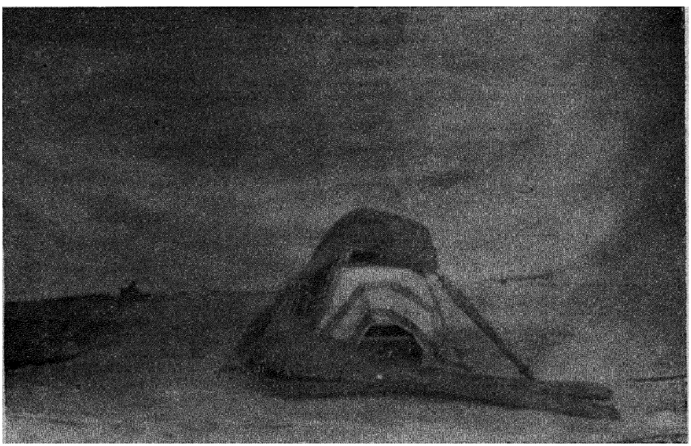
حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ خود میر صاحب نے اپنے لئے ایک محصورہ چوکھنڈی یا گنبد بنوالیا تھا اور اسی میں وہ اپنے اکلوتے فرزند میر مجد الدین محمد کو دفن کر چکے تھے۔ اس سلسلہ میں محبوب الزمن میں لکھا ہے:۔

"میر کی قبر پر بادشاہ کی طرف سے مختصر گنبد پختہ بنایا گیا وہ اب تک موجود ہے۔ اس پر آیات قرآنی وادعیہ ماثورہ کے کتبے بھی موجود ہیں۔ قبر سنگ سیاہ صاف سے بنی ہوئی ہے۔" جلد دوم صفحہ ۹۹۶۔

اس بیان کا آخری جملہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ میر صاحب کا گنبد ان کے بعد بادشاہ نے بنوایا۔ کیونکہ میر صاحب نے خود اپنی زندگی میں اس کو بنوایا تھا اور اپنے فرزند کو اس کے وسط میں دفن بھی کر چکے تھے۔ اگر بادشاہ ان کے بعد چوکھنڈی بنواتا تو میر صاحب کی قبر اس کے وسط میں ہوتی۔

میر صاحب کے گنبد پر آیات قرآنی وادعیہ ماثورہ کے کتبے موجود نہیں ہیں اور نہ ایسے کوئی آثار ہی پائے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہو کہ کسی وقت وہاں کتبے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب محبوب الزمن نے میر صاحب کے مقبرہ کی زیارت ہی نہیں کی۔





اوپر۔ میر محمد مومن کا مزار
نیچے۔ میر محمد مومن کا صندل کا چنور جو ان کی اولاد کے یہاں محفوظ ہے

گنبد پر تو کجا خود میر صاحب کے سنگ مزار پر یا کسی اور پتھر پر کہیں کوئی کتبہ نہیں ہے۔ البتہ ایک چھوٹی سی قبر کے سرہانے ایک کتبہ موجود ہے جس کا ذکر آئندہ صفحہ پر کیا جائیگا۔

میر صاحب جس گنبد میں دفن ہیں اس میں سولہ قبریں ہیں جو سب کی سب مصفیٰ سنگ سیاہ کی بنی ہوئی ہیں۔ خود میر صاحب کی قبر اس مسقف مقبرے کے مغربی گوشہ میں واقع ہے جس کے اطراف لکڑی کا ایک کٹھرا لگا ہوا ہے اس پر غلاف بھی پڑا رہتا ہے اور زائرین ہمیشہ پھول چڑھاتے رہتے ہیں[1]۔ اس قبر سے آگے دیوار کی طرف ایک اور قبر ہے جو اس سلسلہ کی آخری قبر ہے اور اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں میر صاحب کا کتب خانہ دفن ہے۔ لیکن یہ امر قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے کہ اس میں خود میر صاحب کی بیوی دفن ہوں۔ کتب خانہ دفن کرنے کی شہرت نہ معلوم کیونکر ہوی۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ میر صاحب کے پس ماندوں میں چونکہ سب کم عمر بچے رہ گئے تھے اس لئے ممکن ہے کہ میر صاحب نے اپنی ان کتابوں کو جن میں عملیات اور اوراد و وظائف درج تھے دفن کرنے کی وصیت کی ہو۔ لیکن یہ محض ظنی بات ہے۔ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میر صاحب کی اور مجد الدین محمد کی قبر کے درمیان ایک اور زنانی قبر ہے جس میں ممکن ہے کہ مجد الدین کی بیوی مدفون ہوں۔ مجد الدین کی قبر کے سرہانے دو قبریں ہیں جن میں سے ایک پر کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔ لیکن شبہ ہے کہ شاید یہ کتبہ باہر کی کسی قبر سے متعلق ہوگا اور بعد کو

---

[1] اس سے متعلق مزید تفصیل میر صاحب کے تصرفات کے باب میں درج ہے۔

کسی نے اندر لاکر رکھدیا ہے۔ بہرحال اس کتبہ کی عبارت صاف طور پر پڑھی نہیں جاتی۔ صرف حسب ذیل الفاظ سمجھ میں آسکے۔

میر سید حسین علی از دہر — چوں بخلد بریں اجل با (؟) شد
گفت تاریخ فوت او ہاتف — سن قبرش میر صاحب نشد (؟)

چونکہ میر صاحب کے گنبد میں یہ ایک ہی کتبہ موجود ہے۔ اس لئے اس کو یہاں لکھا گیا لیکن اس سے کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

میر صاحب کی چوکھنڈی کی صفائی اور جاروب کشی وغیرہ کے لئے مولوی میر عباس علی صاحب (حال سجادہ نشین) نے خدمت گار متعین کر دئے ہیں اور خود بھی ہفتہ میں کم از کم دو تین بار وہاں حاضر رہتے ہیں۔

عرس میر صاحب کا عرس ہر سال ماہ شعبان میں منایا جاتا ہے۔ ۲۶ کو صندل اور ۲۷ کو چراغاں ہوتے ہیں۔ دونوں روز میر صاحب کے معتقد کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہیں عرس محکمہ امور مذہبی صرفخاص کے اہتمام میں کیا جاتا ہے صندل پنجہ شاہ سے روانہ ہوتا ہے اسکے ساتھ سجادہ صاحب اور عقید تمند رہتے ہیں اخراجات عرس کے لئے سرکار سے (۶۶۵) روپے سالانہ اور عود گل کے لئے ماہانہ (۵۰) روپیہ ۱/۳ مقرر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ساٹھ ستر سال قبل سرکار سے عرس کے لئے کوئی اخراجات مقرر نہ تھے چنانچہ خواجہ غلام حسین خاں نے سنہ ۱۲۶۰ھ یعنے آج سے تقریباً سو سال قبل لکھا تھا کہ :۔

"عرس شریف آں حضرت در آخر ماہ شعبان می شود ہیچ از معاش و یومیہ وزمین

وغیرہ بالکل نیست"[1]

اس تاریخ سے نصف صدی قبل کے ایک اقرار نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں میر صاحبؒ کا عرس اور چراغاں منانے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ سید آباد کی مسجد اور سرائے کے متولی سید حسین ولد سید جلال نے میر صاحب کے پوترے میر محمد حسین ابن میر سید محمد ابن میر محمد شفیع سے وعدہ کیا تھا کہ ہر سال عرس کے اخراجات میں پانچ روپے دیا کرونگا۔ چنانچہ اس اقرار نامہ کا ذکر اس کتاب کے صفحہ ۸۳ پر گذر چکا ہے۔ اس میں سید حسین نے لکھا ہے :۔

"راضی شدم کہ سال بہ سال در ماہ شعبان پنج روپیہ برائے چراغان عرس و فاتحہ سالیانہ می دادہ باشم۔ بعد من قائم مقام من سال بہ سال می دادہ باشند"

یہ تحریر غرہ جمادی الاول ۱۱۸۵ھ کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو سید حسین کی اولاد یا جانشینوں نے اس اقرار نامہ کی پابندی نہیں کی۔ چنانچہ اس کے ۳، سال بعد غلام حسین خاں نے گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ عرس شریف منانے کے لئے کوئی آمدنی نہیں ہے۔

اس اقرار نامہ سے ستائیس سال قبل کے ایک محضر سے جو میر سید محمد ولد میر محمد شفیع کا لکھا ہوا ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت میر صاحب کی اولاد اس قابل نہ رہی تھی کہ ان کا عرس کر سکے۔ یہ محضر ۵ رمضان سنہ ۱۱۶۰ھ کا مکتوبہ ہے اس میں لکھا ہے :۔[2]

"وطعام سالیانہ بزرگان ممکن نمی شود کہ بکنم"

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۶۱۹ — [2] اس محضر کا ذکر اور کچھ اقتباسات اس کتاب کے صفحات ۶۶ و ۶۸ پر بھی درج ہیں۔

اِن واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ میر صاحب کی اولاد ان کے بعد کتنی کس مپرسی اور تباہی کی حالت میں آگئی تھی در ان کا عرس اور سالانہ فاتحہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ زوالِ قطب شاہیہ یعنے سن ۱۱۰۰ھ کے بعد نصف صدی تک یہ لوگ ایسے پریشان حال رہے کہ شاید اس اثنا میں کسی کو میر صاحب کا عرس کرنے کا خیال بھی نہ آیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ دو نسلوں کے بعد آصفی عہد میں جب کچھ حالت سنبھلی اور عرس کرنا چاہا تو نئی نسل کے لوگ میر صاحب کی اصل تاریخ وفات بھی بھول گئے تھے اسی لئے شعبان میں عرس کرنے لگے کیونکہ یہاں اس کو عام طور پر مُردوں کا مہینہ کہا جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب مختار الملک کے عہد میں عرس کے لئے ایک ہزار روپیے سالانہ منظور ہوئے تھے چنانچہ حال سجادہ صاحب کے دادا میر عباس علی صاحب کے زمانہ میں اتنی رقم ملتی تھی لیکن بعد کو نہ معلوم کیوں اس میں تخفیف ہوئی۔

چھٹا حصّہ

تصنیف و تالیف

میر صاحب کی تصنیف و تالیف کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) نثر اور (۲) نظم۔ اور ہمیں تو کوئی شک نہیں کہ نثر و نظم دونوں قسم کے مساعی کے لحاظ سے میر صاحب کو علمی و ادبی دنیا میں ایک خاص وقعت حاصل ہے۔ لیکن یہ عجیب واقعہ ہے کہ دکن میں تقریباً تین چوتھائی عمر بسر کرنے اور پینتالیس سال سے زیادہ عرصہ تک مقیم رہنے کے باوجود انھوں نے اُردو میں غالباً کچھ نہیں لکھا۔ ان کی اُردو دانی کا ثبوت رسالہ مقداریہ کے بعض الفاظ سے ملتا ہے لیکن کسی تاریخ یا تذکرہ میں ان کی اُردو تصنیف و تالیف یا اُردو سے کسی قسم کے تعلق کا ذکر نہیں ملتا۔ حیرت اس کی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا دورِ حکومت جو اُردو کا زرین عہد کہلاتا ہے میر محمد مومن کو متاثر نہ کر سکا! اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ان کا رتبہ اتنا ارفع و اعلیٰ تھا کہ ان کے لئے بادشاہ کو خوش کرنے کی خاطر اُردو میں لکھنا ضروری نہ تھا۔ ان کا علم و فضل اور تقدس ہی ان کی سب سے اہم خصوصیت تھی۔ اس لئے کسی اور طریقہ سے سعی و سفارش فراہم کرنے کی انھوں نے کوشش نہ کی۔

فارسی نثر

وہ فارسی کے بہت اچھے انشا پرداز تھے۔ اس کا ثبوت ان کی ان تحریروں سے ملتا ہے جو اس کتاب کے صفحات (۱۴۴) اور (۱۵۱) پر درج ہیں۔ ان میں سے ایک تو شاہ عباس صفوی والی ایران کے نام خط ہے اور دوسرا کتاب کنیز المبامن کا دیباچہ۔ افسوس ہے کہ ان کے دوسرے خطوط اور انشاء کے نمونے اب تک کہیں نظر سے نہ گذرے۔

البتہ ان کی دو تصنیفات کا ذکر ملتا ہے۔ رسالہ مقداریہ اور کتاب الرجعت۔ ان دونوں کی نسبت ذیل میں اختصار کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

رسالہ مقداریہ یہ کتاب میر صاحب نے سلطان محمد قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ نے قانونی ضرورت کے لئے شرعی و طبی اوزان وغیرہ کے معاملات میں مختلف ماہرین کے آپس میں اختلاف رائے دیکھ کر میر صاحب سے خواہش کی کہ وہ ایک ایسی محققانہ کتاب لکھ دیں جو قول فیصل کا کام دے۔ چنانچہ خود میر صاحب لکھتے ہیں:۔

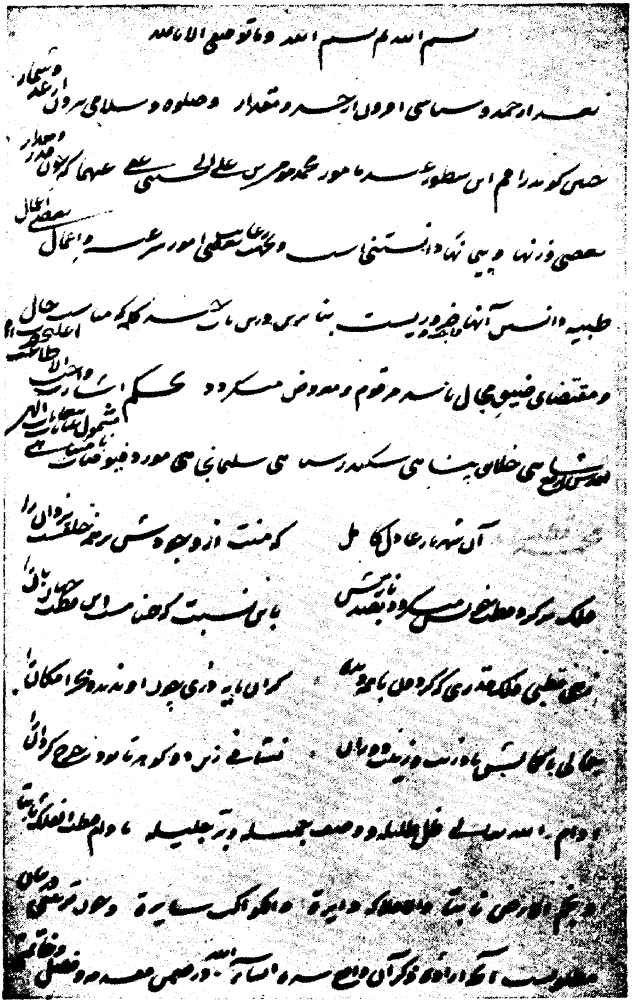
"چوں قدر و مقدار بعضے وزنہا و پیمانہا دانستنی است و بجہتہ رعایت بعضی امور شرعیہ و بعضی اعمال طبیہ دانستن آنہا واجب و ضروری است بنابریں دریں باب چند کلمہ در مناسب حال و مقتضائے ضیق مجال باشد مرقوم و معروض می گردد بہ حکم اشارت واجب الاطاعت اعلیٰ حضرت اشرف اقدس[1]"

یعنے شرعی اور طبی امور کے لئے بعض وزنوں اور پیمانوں کا ٹھیک طور پر جاننا ضروری ہے اسلئے سلطان محمد قطب شاہ کے حکم کی بنا پر جو کچھ مجھ سے ہو سکا لکھ رہا ہوں۔

موضوع، سبب تالیف اور مدح بادشاہ کے بعد میر صاحب نے کتاب کی ترتیب کا ذکر کیا ہے کہ یہ کتاب مقدمہ، فصل اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

مقدمہ مقدمہ میں موضوع سے متعلق عام باتیں لکھی ہیں اور یہ لکھا ہے کہ جن اوزان کی

[1] مزید عبارت اس کتاب کے صفحات ۱۴۹ و ۱۵۰ پر درج ہے۔


بسم الله لم بسم الله و ما توفیقی الا بالله

بعد از حمد و سپاس بیرون از حد و مقدار و صلوة و سلام بیرون از عد و شمار

میر محمد مومن کی تحریر کا عکس

زیادہ ضرورت ہوتی ہے ان کو اصل قرار دیکر ان کے ضمن میں دوسرے اوزان کا بھی تذکرہ کردیا گیا ہے۔ اور پھر اپنے ماخذ بیان کئے ہیں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ لغت، فقہ اور طب کی معتبر کتابوں سے ماخوذ ہے۔ وہ کہتے ہیں :۔

ماخذ

"آنچہ مذکور می شود ہمہ از کتب معتبرۂ لغت و فقہ و طب مانند صحاح جوہری، و قاموس فیروز آبادی، و مہذب الاسما، و بعضے از تصانیف علامۂ زماں شیخ جمال الدین مطہر حلّی، و شیخ الفقہا المتاخرین شیخ شہید عاملی، و از قانون رئیس الحکما شیخ ابو علی، و ذخیرہ سید اسمٰعیل جرجانی، و جوامع الادویہ عمدۃ المطببین المتجبین بدر الدین الزنجانی وغیر ذالک"

ماخذات کی اس طویل فہرست کے علاوہ رسالہ میں اور متعدد کتابوں کے نام بھی نظر سے گذرتے ہیں اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ میر صاحب کا مطالعہ کتنا وسیع تھا اور دوسری یہ کہ اس زمانہ میں لغت، فقہ، اور طب کی کون کونسی کتابیں معتبر سمجھی جاتی تھیں۔ ایک خاص کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں میر صاحب نے جب اتنی کتابوں سے مدد لی تھی تو ظاہر ہے کہ ان کا عام مطالعہ کتنا وسیع ہوگا۔

فصل

مقدمہ کے بعد میر صاحب نے فصل شروع کی ہے۔ اور اس فصل کو بارہ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصہ میں ایک ایک وزن کی نسبت نہایت تحقیق کے ساتھ معلومات درج کی ہیں اور ساتھ ہی اس سے قریب تر ذیلی یا غیر اہم اوزان کا تذکرہ بھی کردیا ہے۔ میر محمد مومن نے جن بارہ اوزان کو معیاری قرار دیکر ان کی نسبت تحقیقی معلومات قلمبند کی ہیں

ان کی فہرست حسب ذیل ہے ۔

(۱) حبّہ	وزن ایک جو	(۷) استار	وزن ساڑھے چار مثقال
(۲) طسوج یا تسو	〃 دو جو	(۸) اوقیہ یا وقیہ	〃 〃 سات 〃
(۳) قیراط	〃 چار جو	(۹) رطل	〃 بارہ اوقیہ
(۴) دانق یا دانگ	〃 آٹھ جو	(۱۰) من	〃 دو رطل
(۵) درہم یا درم	〃 اڑتالیس جو	(۱۱) کیلجہ	〃 دو من
(۶) مثقال	〃 اڑسٹھ جو	(۱۲) مکو یا مکوک	〃 تین کیلجہ

ہر وزن کے سلسلہ میں میر صاحب نے کتابی معلومات کے علاوہ ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اور دکن کے متعلقہ اوزان یا ان کے ناموں کی وضاحت کردی ہے تاکہ یہ کتاب سلطان محمد قطب شاہ اور اہل دکن کے لئے بھی کار آمد ثابت ہو ۔

مثال کے طور پر ہم ذیل میں دو اوزان کی نسبت میر صاحب کی اصل عبارتیں نقل کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے کیسی تحقیق اور محنت سے یہ رسالہ لکھا تھا ۔ پہلے ایک چھوٹے وزن سے متعلق عبارت نقل کی جاتی ہے ۔

قیراط آں مقدار چہار جو است ۔ چنانچہ در قانون شیخ و ذخیرہ خوارزم شاہی ذکر شد ۔ و در صحاح و قاموس نیز مذکور است ۔ پس جو ربع قیراط یعنے چہار یک او باشد و تسو نصف او ۔ و بہ نسبت او بہ باقی اوزان از ملاحظہ باقی معلوم خواہد شد ۔ و

قیراط بست و یک مثقال است۔ یعنے یک حصّہ از بست حصۂ مثقال نیز مذکور ساختہ اند۔ چنانچہ از قاموس ظاہر می شود۔ وفقہا در باب زکواۃ باین معنی استعمال نمودہ اند چنانچہ در خاتمہ انشاء اللہ تعالیٰ توضیح معنی او اشارہ شود۔ بنابر ایں از چہار جو کمتر است بلکہ سہ جو۔ و سہ حصہ از ہفت حصّہ یک جو خواہد شد۔ چنانچہ بعضے از فقہائے معتبرین بیان نمودہ اند۔ واز کلام صاحب جوامع ادویہ چناں ظاہر است کہ نزد اطبا قیراط ہماں معنیٔ اول است پس چہار جو باشد۔ ودر کتب ایشاں باین عبارت آوردہ اند کہ قیراط چہار جو است۔ ودر بعضے از کتب طب خرنوب نیز در اوزان بعضے از داروہا مذکور می گردد۔ وخرنوب شامی را در جوامع الادویہ ودر ذخیرہ وغیرہا یک قیراط گفتہ اند۔ و پنگچی کہ در بعضے بلاد دکن بلکہ در کل بلاد ہند نزد زرگراں و بعضے دیگر مستعمل است مقدار آں از ہنسو قدرے بیشتر واز قیراط کمتر ظاہر شدہ۔ تقریباً سہ جو و نیم میانہ نزدیک خواہد بود۔"

اب ایک مشہور وزن یعنے درہم سے متعلق میر صاحب کی تحقیقات پیش کیجاتی ہیں۔

درہم | درم نیز گویند۔ وآں مقدار چہل وہشت حبّہ است کہ چہل وہشت جو میانہ باشد۔ چنانچہ در صحاح وقاموس ودیگر کتب معتبرہ مذکور است۔

حضرت شیخ جمال الدین مطہر در قواعد فرمودہ کہ درم بچند وزن مختلف بودہ۔ در اسلام بریں وجہ قرار گرفتہ کہ ہر یک درہم شش دانگ باشد کہ ہر یک

دانگے ہشت جو میانہ است۔ واختلاف وقرار دادے کہ شیخ اشارہ فرمودہ بیان آں در بعضے از کتب معتبرہ بریں وجہ ظاہر شدہ کہ زمان جاہلیت کہ زمان پیشتر از زمان حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ و متصل باں بود' درآں زماں چند قسم درہم بودہ۔ ازانجملہ یک قسم درہم طبری می گفتہ اند بجہت نسبت او بہ طبریہ کہ بعضے از بلاد شام است۔ وایں قسم درہم سبک بودہ۔ چنانکہ ہر درہمے چہار دانگ بودہ است کہ سی و دو جو باشد۔

و یک قسم دیگر درہم سنگین بودہ چنانچہ درہمے ازاں ہشت دانگ بودہ است وایں درہم راعبدی می گفتہ اند وبغلی نیز کہ در بعض احکام شرعیہ ذکر نمودہ اند۔ عبارت ازیں درہم ہشت دانگ است۔ بعدازاں درہم سبک وسنگین را باہم جمع نمودہ اند۔ ووزن ہر دو را برابر داشتہ اند کہ شش دانگ باشد۔

ونوعے دیگر بہ نظر رسیدہ اما چوں مقام مقتضی تفصیل زیادہ نیست' ترک نمودیم۔ وازکتب ظاہر نہ شدہ کہ بعداز قرار درہم بوجہے کہ مذکور گردید و استعمال درہم درمیاں علمائے لغت وشرع وطب اختلافے باشد۔ پس درہم طبی وشرعی ہر دو در وزن موافق است۔ واز صحاح وقاموس نقل شدہ۔ پس حبہ یک بخش باشد از چہل وہشت درہم۔ وتسوج یک بخش ازجملہ بست و چہار بخش او وقیراط یک بخش باشد ازجملہ دوازدہ بخش او۔ ودانگ یک بخش ازجملہ شش بخش او۔ ونسبت درہم باوزان دیگر ہم مذکور می گردد انشاءاللہ تعالیٰ

معلوم خواہد شد۔

وباقلائے یونانی نیز درضمن بعضے از اوزان درکتب طب مذکور شدہ و درجوامع الادویہ و ذخیرہ وزن آنرا بست وچہار جو بیان نمودہ اند کہ نصف درہم باشد۔

وباقلائے مصری را درجوامع چہل وہشت جو گفتہ کہ برابر درہم باشد۔

وباقلائے اسکندریہ را نُہ قیراط گفتہ اند کہ سی وشش جو باشد۔

اسی طرح بارہ اوزان کے متعلق لکھا ہے۔ خاصکر من کی نسبت بہت اچھی معلومات قلمبند کی ہیں۔ اور مختلف مقامات پر مَن کے وزن میں جو فرق کیا جاتا ہے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے ہم میر صاحب کے اس بیان کو یہاں نقل نہیں کرسکتے۔

خاتمہ فصل کے بعد خاتمہ لکھا ہے۔ اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّہ میں بنبھر کے پانچ وزنوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کو پنچوزن کہتے تھے۔ جن میں سے پہلا ایک درم کے برابر ہوتا ہے اور بقیہ کے اوزان یہ ہیں۔ (۲) تین درم (۳) ۹ درم (۴) ۲۷ درم (۵) ۶۰ درم۔

دوسرے حصّہ میں میل، فرسخ اور برید کی تفصیل بیان کی ہے۔ اور تیسرے حصّہ میں وزن و مساحت کی نسبت عام معلومات لکھی ہیں۔ چونکہ میل، فرسخ اور برید کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے اس لئے اس بارے میں میر صاحب نے جو تحقیقات کی تھیں وہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

میل و فرسخ و برید

درمیان میل و فرسخ و برید که در بیان قدر مسافت راه ها مذکور میگردد و دانستن مذکورات از جمله اموری است که بجهته احکام شرعیه گاہے ضروراست ۔

میل کمتر از فرسخ و برید است ۔ پیش اہل لغت عرب آں قدر مسافت است که در زمین ورنظر کسی هر دَر دیدن او قصوری نباشد و بسیار تیز بین نباشد تا بآنجا تواند رسید ۔ در صحاح و قاموس و مغرب اللغت و در بعضے از کتب فقه بریں وجه مذکور ساخته اند و شیخ زین الدین در شرح شرائع ذکر کرده که در دیدن مذکور پیاده را از سواره فرق تواں نمود ۔ و در بعضے از جائیها از برائی ابتدا و انتها علامتی گاہی مقرر می داشته اند بشکل مخروطی و ایں قدر مخصوص است بر زمینی که هموار باشد ۔ بنا برایں قدر مسافت مزبوره را در زمین هموار ملاحظه باید نمود ۔ و بحساب ذراع نیز بیان نموده اند تا در زمین هموار و ناهموار ملاحظه تواں نمود ۔

و میلی که بحساب ذراع مشخص شود آں را میل هاشمی گویند و آں مقدار چهار هزار ذراع است و سبب نسبت او به هاشم در کتاب مغرب اللغت و بعضے از کتب فقه بیان نموده اند که میل را بحساب ذراع ملاحظه نمودن و چهار هزار ذراع مقرر داشتن از فرزندان هاشم که جد حضرت پیغمبرؐ است واقع شده و ذراع که در بیان میل مذکور شد عبارت از ابتدائے ساعد است که آں را بزبان عربی مرفق گویند تا سر انگشتاں ۔ و چوں گز را در قدیم همیں مقدار مقرر داشته بودند ذراع را

بمعنی گز استعمال نموده اند چنانچه مشهور است۔ وتعیین ذراع در کتاب معرب اللغت وفقها نیز برایں وجه واقع شده که مقدار شش قبضه است یعنی شش مشت که انگشتان غیر انگشت شست باشد با یکدگر متصل ساختہ بآں ملاحظه نمایند و ایں مجموع بقدر بست وچهار انگشت خواهد شد که از جانب پهنائے یکدگر گذارند و شیخ جمال الدین مطهر رحمة الله در قواعد بیان نموده و پهنائی هر انگشت نیز در کلام فقها بواسطه زیادتی ضبط بیان شده که پهنائی هر انگشتی مقدار هشت جو است که از جانب پهنا میانه آنها رایکدگر متصل سازند و بعضی شش جو گفته اند و در شرح لمعه مذکور است که پهنائی هر جو بقدر هفت موئی است از اسپان یابو. فرسخ که بفارسی فرسنگ گویند بحساب میل سه میل است چنانکه دوازده هزار گز باشد بہ گزے که مقدار آں بیان شد صاحب قاموس گفته یک فرسخ سه میل هاشمی است یا دوازده هزار ذراع لیکن از فقهائی امامیه رضوان الله تعالی علیهم چناں به نظر رسیده که ده هزار ذراع است و در قواعد و شرایع و بعضی دیگر از کتب متداوله برایں وجه است که فرسخی سه میل است و هر میل چهار هزار ذراع بُرید چنانچه در صحاح مذکور است چهل و هشت هزار گز است که چهار فرسخ باشد و موافق این است آنچه در شرایع و بعضے دیگر از کتب فقه مذکور است پس قصر نمودن روزه و نماز با شرائطی که در محل خود مرقوم است نزد فقهائی امامیه آن است که هشت فرسخ باشد از ایں فرسخی که بیان شد و چون هشت فرسخ بحساب میل بست و چهار میل است و بحساب بُرید دو برید

کلام فقہا برایں وجہ واقع شدہ کہ دو بریداست چنانچہ در کتاب شرائع بیان شدہ
وچون آنقدر بحساب ذراع نود وشش ہزار ذراع می آید گاہی بیان مسافت
مذکور را بدیں وجہ تفسیر نمودہ اند کہ مقدار نود وشش ہزار ذراع است چنانچہ
شیخ المتاخرین شیخ شہید در لمعہ دمشقیہ فرمودہ وچون فرسخ در بیان قدر مسافتہا
بیشتر مذکور میگردد در کلام اکثر فقہا بیان چنیں شدہ کہ ہشت فرسخ و ہر فرسخی
دوازدہ ہزارہ ذراع و ہر ذراعی بست وچہار انگشت و بیانات مذکورہ ہمہ
با یکدگر در حساب موافق است ۔

رسالہ مقداریہ کی مقبولیت

رسالہ مقداریہ بہت مقبول ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کو ایک مستند حوالہ کی کتاب سمجھ کر اس کی نقلیں اپنے یہاں رکھتے اور وقت بوقت مطالعہ کرتے رہتے تھے ۔ چنانچہ اس وقت اس رسالہ کے کئی قلمی نسخے موجود ہیں جن سے راقم الحروف نے استفادہ کیا ہے ۔ ان میں سب سے اہم مخطوطہ خود میر محمد مومن کا لکھا ہوا یعنے مصنف کا اصل مسودہ ہے جو نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے ۔ اس کے سرورق پر سلطان محمد قطب شاہ کی حسب ذیل مہر ہے :۔

بندۂ شاہ نجف سلطان محمد قطب شاہ
١٠٢٠ھ

اور خود کتاب کی لوح پر لکھا ہے ۔

"رسالہ مقداریہ در اوزان ۔ تصنیف میر مومن پیشوا رحمۃ اللہ و ایں نسخہ متبرکہ بخط مصنف است قدر دانستنی است"

اس عبارت کے ساتھ سلطان محمد کی وہ مشہور مہر (مہر سلیمان زحق گشتہ میسر مرا) بھی ثبت ہے جو اس کی اکثر تحریروں کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ کا وہ اصل مسودہ ہے جو میر صاحب نے بادشاہ کے لئے لکھ دیا تھا۔

(۲) اس نسخے کے ساتھ ایک ہی جلد میں اس رسالہ کا ایک اور نسخہ شریک ہے جو بعد کو لاہور میں نقل کیا گیا تھا۔

(۳) نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں اس رسالہ کا ایک تیسرا نسخہ بھی ہے جو خط نسخ میں ۱۲ ذیحجہ ۱۲۷۶ھ میں لکھا گیا ہے۔

۴ اس کا چوتھا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں نظر سے گذرا جس کا کاتب محمد رفیع بن عصام الدین محمد ہے اور جس نے یہ کتاب ۳۰ رمضان ۱۰۵۳ھ میں نقل کی ہے۔ کاتب کا نام اسکے ساتھ کے دوسرے رسالہ پر درج ہے جو ایک ہی جلد میں منسلک ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی کاتب نے دونوں کتابوں کی نقل لی ہے۔ یہ قلمی نسخہ کتب خانہ کے مجامیع فارسی کے نمبر ۳۱ پر محفوظ ہے۔

کتاب رجعت میر صاحب نے علم حدیث میں بھی ایک کتاب تالیف کی تھی۔ جس کی نسبت عبد الجبار خاں نے لکھا ہے۔

"آپ نے حدیث و ادب میں مولانا سید علی الملقب نور الدین الموسوی شستری سے اجازت و سند حاصل کی ہے اور آپ کی تصنیف سے کتاب رجعت ہے[۱]"

---

[۱] محبوب الزمن حصہ دوم ص ۹۹۵

افسوس ہے کہ کتاب رجعت کا کوئی نسخہ اب تک نظر سے نہ گذرا۔ لیکن یہ یقین ہے کہ میر صاحب نے یہ کتاب لکھی تھی کیونکہ قصص العلماء میں آقا مرزا محمد بن سلیمان بن محمد تنکابنی نے بھی نورالدین کے ذکر میں لکھا ہے کہ:۔

"میر محمد مومن استرآبادی صاحب کتاب رجعت ازیں بزرگوار اجازہ دارد"[1]

میر صاحب نے جن بزرگ سے استفادہ کیا تھا ان کی نسبت مرزا محمد نے تفصیل سے لکھا ہے کہ:۔

سید علی بن سید علی بن ابی الحسن الحسینی الابراہیمی الموسوی ملقب بہ سید نورالدین مشتعلہ ذکاوت وفطانت وفضیلت ونقاوت وزہادت وعبادت وزرانت است ومیر محمد مومن استرآبادی صاحب کتاب رجعت ازیں بزرگوار اجازہ دارد۔ وایں بزرگوار اجازہ دارد از برادر و پدر خود سید ابوالحسن شمس الدین وسید محمد صاحب مدارک واو از برادرے خود جمال الدین ابومنصور شیخ حسن بن شہید ثانی۔

وسید نورالدین فاضل ومحقق بودہ .... متوطن مکہ شد۔ وتالیفات او درنہایت جودت ...... دربلاد شام بود وصاحب شام را باو اختزام تمام بود۔ پس بمکۂ معظمہ رفت۔ وعمرش از نود تجاوز کرد۔ وحال ایں کہ استعانت باحدے نمی کرد۔ بلکہ مردمان باو استعانت می جستند۔ ووفات او درسال ہزار شصت ودو (۱۰۶۲ھ) دتوع یافت۔ درشعر یدطولے داشت مشہو ہر دیار بود"[2]

---

[1] و [2] دیکھو قصص العلماء ص ۶۶ ۔

اس طویل عبارت سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) صاحب تذکرہ نے سید علی نورالدین جیسے مشہور فاضل و محقق و مدقق کے ذکر میں میر صاحب کی شاگردی کے بیان کو اتنا اہم سمجھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ اس کے اظہار کے بغیر استاد کی فضیلت کو واضح نہ کر سکتا تھا۔

(۲) میر صاحب اپنے استاد کے تقریباً ہم عمر تھے کیونکہ استاد نے شاگرد کے اٹھائیس سال بعد وفات پائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب نے بڑی عمر میں معاصرانہ طور پر ان سے استفادہ کیا تھا۔

سلسلۂ اجازت

(۳) میر صاحب کے سلسلۂ اجازت کا بھی اس سے پتہ چل جاتا ہے۔ اور یہ چیز بہت اہم ہے۔ کیونکہ حدیث و تصوف میں جب تک اجازت و ارشاد کا سلسلہ نہ معلوم ہو محدث اور مرشد کے اقوال و افعال مستند نہیں سمجھے جاتے۔ اس طرح میر صاحب کا سلسلہ اجازت یہ ہے کہ:۔

میر محمد مومن ← سید علی نورالدین ← سید اوحد شمس الدین ← سید محمد صاحب مدارک ← جمال الدین ابومنصور شیخ حسن بن شہید ثانی۔

ہم نام مصنفین

میر صاحب کی دیگر تصنیفات کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ البتہ اس سلسلہ میں تحقیق و تلاش سے معلوم ہوا کہ میر محمد مومن نام کے کئی اور اصحاب مصنف و مولف گذرے ہیں جن میں سے دو کی کتابیں راقم کے مطالعہ میں آئی ہیں۔ چونکہ آئندہ نام کی وجہ سے شبہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے ان دونوں کی نسبت مختصر سے نوٹ یہاں درج کئے

جانتے ہیں۔

(۱) میر محمد مومن عرشی ابن امیر عبداللہ الحسینی الترمذی ۔ انھوں نے ایک کتاب شکرستان ۱۰۷۲ھ میں لکھی تھی۔ جس کا سنہ تالیف اِس مصرع میں لکھا ہے۔ ع شکرستان ماشدۂ تاریخ۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے[۱]۔ جس کے خاتمہ پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے :—

سیادت و نقابت پناہ، حقائق و معارف آگاہ میر محمد مومن المتخلص بہ عرشی ابن قدوۃ السالکین قطب المحققین امیر عبداللہ مشکین قلم الحسینی الترمذی ۔

(۲) میر محمد مومن رضوی بن سید عبدالمہیمن مسجدی ۔ انھوں نے ایک رسالہ زبدۃ العروض لکھا تھا۔ جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے[۲]۔ اور اس کا سنہ کتابت ۷ ارذیقعدہ ۱۱۵۶ھ ہے۔ اس کتاب کے خاتمہ پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے :—

تمام شد ایں رسالہ مسمی بہ زبدۃ العروض بخوبی و مبارکی المصنف محمد مومن الملقب بہ رضوی بن سید عبدالمہیمن الملقب بہ سید مسجدی ولد سید عبدالغفار موہانی باتمام رسید بتاریخ ہفدہم ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ ۔[۳]

فارسی نظم میر محمد مومن ایک اعلیٰ پایہ کے محقق اور عالم ہونے کے علاوہ بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں ادیب سے زیادہ

---

[۱] دیکھو کتب تصوف فارسی ۱۴۵۳ — [۲] دیکھو کتب بلاغت فارسی ۱۰۷ —

[۳] زبدۃ العروض کی نسبت آئندہ مزید معلومات درج ہیں۔

شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ عالم آرائے عباسی میں ۱۰۲۵ھ میں یعنے ان کی وفات سے نو سال قبل لکھا گیا تھا کہ :-

"صاحب طبیعت۔ گاہے بہ نظم اشعار ملتفت شدہ۔ قصائد و غزلیات و رباعیات مرغوب دارد۔" ط۱۵۹

سلطان محمد قلی قطب شاہ خود شاعر ہونے کے علاوہ شاعروں کا قدردان اور اردو و فارسی شعر و سخن کا دلدادہ بھی تھا۔ اس کے عہد میں بھی میر صاحب نے قصیدے لکھے ہوں گے لیکن افسوس کہ ان میں سے کوئی اب تک نظر سے نہ گذرا۔ البتہ اس دور میں انھوں نے سلطان محمد کی پیدائش کے موقعہ پر جو قطعہ لکھا تھا وہ تاریخوں میں موجود ہے۔ یہ گویا ان کی وفات سے تینتیس ۳۳ سال قبل کا کلام ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت میر صاحب نے جو معرکتہ الآرا قصیدے لکھے تھے ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت ایک پختہ مشق شاعر تھے اور قصیدے بھی کافی تعداد میں لکھ چکے تھے۔

دیوان میر صاحب نے اپنی زندگی میں ایک اچھا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا چنانچہ علی ابن طیفور ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اس دیوان کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں :-

"حضرت میر بے عدیل و نظیر، صاحب طبیعت بود۔ گاہے بنظم اشعار ملتفت شدہ قصائد و غزلیات خوب و رباعیات مرغوب نظم می نمود۔ و دیوانے دارد مملو از اشعار بلاغت شعار۔ و ایں چند بیت از انجملہ کہ حاضر بود بریں اوراق ثبت نمودہ۔"

حدائق ورق ۱۸۰ ا۔

معلوم ہوتا ہے کہ علی ابن طیفور نے یہ دیوان خود دیکھا تھا۔ لیکن جو اشعار اس نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ وہ صرف اپنے حافظہ سے لکھے ہیں۔ دیوان سے انتخاب کر کے نقل نہیں کیا۔

میر صاحب کے دیوان کا ایک نسخہ عہد نواب میر نظام علیخاں آصف جاہ ثانی تک بھی موجود تھا۔ چنانچہ غلام حسین خاں تزین مصنف ماہنامہ نے اس کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"دیوانش بخط خوشنویس خان قطب شاہی بہ نظر راقم ایں اوراق رسیدہ[1]"

اس سے ظاہر ہوا کہ مولف ماہنامہ نے جو دیوان دیکھا تھا وہ قطب شاہی زمانہ ہی کا لکھا ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ اس حیات میر مومن کی ترتیب کے وقت دیوان مومن کی بہت کچھ تلاش کی گئی لیکن اب تک اس کا کوئی نسخہ نظر سے نہ گذرا۔ مجبوراً مختلف تاریخوں اور تذکروں سے میر صاحب کے جو کچھ اشعار ملے انہی کو جمع کر کے ردیف وار مرتب کر لیا گیا ہے۔ اور آئندہ صفحات میں ان کو شریک کیا جا رہا ہے تاکہ اس وقت جو کچھ مل سکا وہی محفوظ ہو جائے اور اس کے مطالعہ سے میر صاحب کی شاعرانہ قابلیت اور خصوصیات کا اندازہ قائم کرنے میں مدد ملے۔

نمونۂ کلام | ہم نے میر صاحب کے کلام کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) قصائد (۲) قطعات (۳) غزلیات (۴) رباعیات۔ اور اسی ترتیب کے ساتھ اسکو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

---

[1] ماہنامہ نسخہ نواب سالار جنگ بہادر ورق ۳۰۵ ب۔

قصائد

قصیدہ جو بہ تقریبِ عید قرباں ۱۰۲۰ھ سلطان محمد قطب شاہ کی بارگاہ میں سنایا گیا

با محبت باز بستم عہد و پیمانِ نوی — کہنہ جانے می فشانم پیش جانانِ نوی
خستہ جانم کہنہ لیکن جانفشانی تازہ است — عہد سلطانِ نو است و عید قربانِ نوی
بہر دفع چشم بد در پیش چشمانِ خوشش — اے دریغا کاش بودی ہر دمم جانِ نوی
کہنہ عالم باز پر افشانیِ سر کردہ است — چوں زلیخا از وصالِ ماہ کنعانِ نوی
قصۂ نوشیرواں شد ہیچ ایوانش کہن — مسند و ایوانِ نو بیند و سلطانِ نوی
عرصۂ میدان ہفت اقلیم تنگی می کند — کو فضا افگن پے شہ طرح ایوانِ نوی
تو دکانِ کہنہ بر چیں عقل از فرزانگی — دوستداری بہر ما بکشود دو کانِ نوی
دل براہِ دوست ہر دم وادئے طے می کند — کعبہ رو ہر دم کند قطع بیابانِ نوی
مصر شاہی را رواج افزوں ز عہد یوسف است — یوسفی گر رفت آمد یوسفستانِ نوی
چرخ اگرچہ آتشی ورزد بعالم ناگہاں — باز جنت شد جہاں از فیض بارانِ نوی
گرچہ از حکم قضا جانِ جہاں بر باد رفت — یافت عالم از مسیح تازۂ جانِ نوی
یادگار جد و عم سلطان محمد قطب شاہ — آں کہ ہندستاں ز فیضش گشتہ ایرانِ نوی

وه چه ایران آنچنان ایران که آید در نظر
رو بهر جانب که آری باغ رضوان نوی

فر و شان لازم شاهی کجا و شان او
پادشاهی یافت در دوران او شان نوی

آسمان را مسند خورشید تابان کهنه بود
کهنه مسند تازه شد از زیب ایوان نوی

صد کهن قانون ز هر دیوان که دیده شسته است
آنکه آگه گشته از قانون دیوان نوی

ای منجم طالع منحوس اعدایش ببین
تا مقرر گردد تاریخ طوفان نوی

ای قضا را از کرم ذات تو صد انتعاش
تا روان کرد است از حکم تو فرمان نوی

ای جهان جسم و جان را از مقدس ذات تو
جان جانان نوی و شاه شاهان نوی

بسکه می تابد ز تو نور سعادت بر جهان
مسلم و کافر بتو آورده ایمان نوی

چرخ آئین بسته عالم را پس مهمانیت
میزبان کهنه دارد باز مهمان نوی

دهر در عهد تو ای دریای مواج کرم
نیست یک دم خالی از اکرام و احسان نوی

کو خضر تا بنگرد از لطف سرشارت بخلق
جوی شاهی را لبالب ز آب حیوان نوی

چرخ را تا آمده قانون دوران بکف
بر همه قانون کشید دو خط بطلان نوی

ای ز میدان وسیع عالم اوصاف تو
مرکب اندیشه را هر لحظه جولان نوی

لطف تو از بهر دوران نوبهار خرمی
جود تو ایام را باران نیسان نوی

از لطافتهای ذات لطف حق گویا که کرد
از وجود ابتدای خلق انسان نوی

چار ارکان گر بود اصل مقدس ذات تو
می توان گفتن که هست آن چار ارکان نوی

پیر گردون با هزاران دیدهٔ روشن ندید
هم چو تو روشن چراغی در شبستان نوی

اے زمانہ از کمیں ہیجائے تو روزِ مصاف — بستہ بر ہم داستانِ پورِ دستانِ نوی
یافت چوں اندیشہ ات در خاطرِ بدخواہ را — از طبیبِ دہر شد محسوب بحرانِ نوی
سرمہ شد خاکِ تلنگانہ ز فرخ پائے تو — اے فدائے خاکِ پاکت ہر زماں جانِ نوی
گر صفاہاں نو شد از شاہِ جہاں عباس شاہ — حیدر آباد از تو شد شاہا صفاہانِ نوی
دولتِ تو نعمتِ کامل بود از حق بہ خلق — ہر کہ قدرِ ایں نداند کردہ کفرانِ نوی
خواستم تاریخِ فرخندہ جلوست عقل گفت — جملہ عالم نوبہاری شد ز سلطانِ نوی
مختصر کردم شہا مدحت کہ خواہد مدحِ تو — چوں فصیحِ خاوراں مداح و حسانِ نوی
از دعاگوئے چو مومن ہم دعا بہتر کہ ہست — او کہن داعی و تو شاہِ جہانبانِ نوی
باد یارب جاوداں ایں شاہی و اقبال و تخت — ہر دمت فتحِ نوی ہر لحظہ فرمانِ نوی
بدسگالت را بجاں صد زخمِ کاری ہر زماں — گہ ز تژوبیں گہ ز خنجر گہ ز پیکانِ نوی

قصیدہ

یہ قصیدہ بھی سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت لکھا گیا

خلعتِ شاہی چو در بر کردہ شاہِ دیں پناہ دہر بر گردوں رساند از شرف طرفِ کلاہ
نور می تابد شب و روز از زمین و آسماں از فروغِ شمعِ رخسارِ شہِ انجم سپاہ
آفتابِ اوجِ شاہی، ماہِ برجِ خسروی آں کہ باشد بر فرازِ نہ سپہرش بارگاہ
خسروِ روئے زمیں شاہنشہِ صاحبقراں شاہ با فتح و ظفر سلطاں محمد قطب شاہ
آنکہ باشد لطفِ عامِ او پناہِ خاص و عام واں کہ باشد نورِ عدلِ او فروغِ مہر و ماہ
از سجود خسرواں روئے زمیں پنہاں شدہ چوں بروں از بارگہ آید بصد اقبال و جاہ
آں کہ باشد در عدالت صد چو کسریٰ بندہ اش واں کہ باشد در سخا صد حاتمش دریوزہ خواہ
ہر کجا بارد سحابِ ہمتش بارانِ فیض در بروں آید بجائے دانہ از شاخِ گیاہ
ہست در اقلیمِ حکمِ او مساوی کبک و باز ہست در میزانِ عدلِ او برابر کوہ و کاہ
اوست شاہِ عالم و از ہر طرف می آورند خسروانِ بحر و بر در سایۂ لطفش پناہ
سایۂ چترِ بلندِ اقبالِ او بر فرقِ مہر پایۂ قصرِ رفیعِ ایوانِ او بر دوشِ ماہ

آنکه گر حفظش شود حامی بگردد تا ابد   تخم مرغ بیوه زن از شدت گرما تباه
موج ساکن می شود در بحر چوں جوہر تیغ   گر کند بر روئے دریا شحنۂ ضبطش نگاه
چوں باقبال و ظفر بر مسند شاہی نشست   خسرو مشرق شہ مغرب ـ بتوفیق اله
بہر تاریخ جلوس او مسیح عقل گفت   پادشاه بے بدل سلطان محمد قطب شاه
تا بود بر صدر جنت مامن اہل ثواب   تا بود در قعر دوزخ مسکن اہل گناه
باد با احباب و اعدایش جہاں خلد و جحیم   باد از شمع رخش روشن چراغ مہر و ماه
شکر ایزد را که گر شاه جہانبانے گذشت   شد جہاں دارِ جواں ملک جہاں را پادشاه
گر قباد از سر کلاه خسروانی بر گرفت   کسری اینک می رساند بر فلک طرف کلاه
خیمۂ اقبال دارا گر بہم پیچیده شد   زد سکندر بر سر ایوان دولت بارگاه
شہریارے پائے بر تخت جہانداری نہاد   کاستانش می سزد خیل ملک را سجده گاه
خاک کویش سرمۂ چشم امید جن و انس   گرد راہش صیقل آئینۂ خورشید و ماه
گر شود دارائی ملک جہاں را مدعی   بخت بیدار دل آگاه باشندش گواه
گر نسیم خلق او بر قبر مجنوں بگذرد   از زمین او نه روید جز گل سوری گیاه
ابر رحمت بار گردد شعلۂ برق غضب   گر شود لطفش گناه عاصیاں را عذر خواه
عالمے او را دعا گویند از دشمن چه باک   شہسوارے را که از فوج دعا باشد سپاه
نام و وصفش دانی و سال جلوسش گر کنی   جمع با صاحب کرم سلطان محمد قطب شاه
یارب آساں کن برآں رسم جہانبانی چناں   کاسماں را دارد از آئین به پیراہی نگاه

باشدش تدبیر ہر کارے موافق با قضا — حکم او را مانعے ہرگز نگیرد پیش راہ

دوستانش را مبادا کام جز بر راہ راست — دشمنانش را مبادا جائے جز در قعر چاہ

روزگار حشمتش را خالق عالم ضماں — آفتاب دولتش را خلق عالم در پناہ

قطعات

قطعۂ تاریخ پیدائش سلطان محمد قطب شاہ

سنہ ۱۰۰۱ھ میں سلطان محمد کی پیدائش (۲۳ ربیع الثانی روز چہارشنبہ) کے موقعہ پر میر حسین صاحب نے یہ قطعۂ تاریخ لکھکر محمد قلی قطب شاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

بازعالم ابتدائے کامرانی کردہ است — صد بشیر کامرانی می برد ہر سو خبر
دودمان ترکماں را خوش چراغے بر فروخت — پرتو شہزادہ بر چرخ می تابد دگر
رونق عز و شرف سلطان محمد زاں آمدست — ہر دو عالم یک صدف از بہر آں عالی گہر
خواستم تاریخ آں فرخندہ گوہر عقل گفت — اول کام است و فیروزی و اقبال و ظفر
چوں دعا بہ زیں نمی دانم ازاں می گویمش — سرور عالم شوی در ظل اقبال پدر

قطعۂ تاریخ پیدائش شہزادہ علی مرزا

بتاریخ ۲۸ شوال ۱۰۲۵ھ بمقام حیدرآباد

خدائے داد بقطب شہاں محمد شاہ — دو شاہزادہ کہ ہستند رشک شمس و قمر
دو نور بخش بعالم کہ چوں پدر ہستند — ز رحمت ازلی نیک بخت و نیک اختر

میان ہر دو چو آمد تفاوت دو سال	چو خواہی از پے تاریخ شان شوی رہبر
حساب سال یک از کام بخش جانہا جو	زکام بخش بجا نہا حساب آں دیگر
دعائے ہر دو مرا خوش رسیدہ است از غیب	عجب خجستہ دعائے زہر دعا خوشتر
کہ باد دولت و اقبال شان بعمر خضر	بظل چتر ہمایون جہاں فزائے پدر
کدام شاہ بود آں کہ در کمال آمد	بہ فہم و فضل ارسطو بہ دولت اسکندر
چو ذات اقدس او راز مدح استغنا ست	مرا دعائے دگر ہم بپے سخن زیور
زحادثات زمانہ پناہ ذاتش باد	خدائے جل جلالہ بحق پیغمبر

قطعہ در مدح سلطان محمد قطب شاہ

جو رسالہ مقداریہ کے دیباچہ میں درج ہے

محمد قطب شاہ آں شہریار عادل کامل	کہ منت از وجودش بر ہمہ خلق است یزداں را
فلک سر گرد قطب خویش می گردد پے صد نازش	بایں نسبت کہ ہم نامست ایں قطب جہانباں را
زہے قطبے فلک قدرے کہ گردوں با ہمہ دیدہ	گراں مایہ درے چوں او ندیدہ بحر امکاں را
جمال باکمالش ماہ زیب و زینت دوراں	نشانے زیں دو گوہر تا بود نہ چرخ گرداں را

غزلیات

شاد مانیست بندۂ غم ما | عالم دیگر است عالم ما
حبذا عشق و رستخیز بلا | اے خوشا روزگار برہم[۱] ما
شکر ورد تو چوں کنیم کہ ہست | داغ بالائے داغ مرہم ما
شاہ اقلیم درد و غم ما ہیم | ملک ہجراں سواد اعظم ما
سایۂ عشق کم مبادا ازو[۲] | سور شد داغ دار ماتم ما
نمک آب[۳] دیدہ خوش نمک ایست[۴] | کم ز کوثر مگیر زمزم ما
ید بیضائے[۵] وصل کو کہ فراق | گشتہ ثعبان آتشیں دم ما
حرفے[۶] از ہم نشیں بگو با او | روز وصل از زبان ابکم ما
غمگساری ازو مجو مومن | غم ما از کجا و مرہم[۷] ما

(ح۔ع و فرشتہ و حدائق)

---

۱ درہم ما (فرشتہ و م۔ز) ۲ کزو (فرشتہ) ۳ آں دو دیدہ (فرشتہ) ۴ نمکیں است (م۔ز)
۵ و وصل (ح۔ع) ۶ حرف اے ہم نشیں گو با ما (فرشتہ) ۷ بے غم ما (ح۔ع و م۔ز)۔

خدایا[1] وارہاں از شور بختی دلفگاری را — گلستاں[2] کن بیک باران رحمت شورزاری را
شدم پر از غمت غافل مشو از روزگار من — کہ من بر یاد شوقت دادہ ام خوش روزگاری را
دلا پیوستہ با ناسازگاراں سازگاری کن — کہ باشد سازگار خود کنی ناسازگاری را
خماری بر خمارم می[3] دہد گردوں ز یک مستی — چہ خوش بودی کہ دادی مستی ہم ہر خماری را
مرا بس این کہ دارم حکم بر اقلیم ناکامی — مسلم باد ملک کامگاری بختیاری را
ز شہد ناگوار چرخ کام عافیت سوزد — بحمد اللہ نصیبم کرد زہر خوشگواری را
بہ تلخی جاں[4] دہ وکمتر حدیث[5] درد گو مومن — چہ غم از تلخی ناکامی ما[6] کامگاری را

(ح ۔ ع و فرشتہ)

خوش آنکہ بر تو شرح دہم مشکل خود را — وا کردہ نمایم بتو داغ دل خود را
در حشر کنم دعوی خوں بر تو کہ شاید — یکبار دگر زار کشی بسمل خود را
از لطف تو ویرانی مومن عجبی نیست — چوں بحر کہ آشفتہ کند ساحل خود را
لیلیٰ چو ز محمل نگرد جانب مجنوں — آراستہ ناز کند محمل خود را
فردا کہ ہمہ حاصل خود را بنمایند — من نیز نمایم دل بے حاصل خود را

(حدائق)

---

[1] خدارا (فرشتہ)۔ [2] فرشتہ میں اس مصرع کو حذف کر کے اسکی جگہ دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ لکھا گیا ہے۔
[3] وہم (ح ۔ ع) [4] مدہ (فرشتہ) [5] کام (فرشتہ) [6] نا (ح ۔ ع)۔

عاشق آن قدر کجا دارد که گردد گرد دوست   مانمی دانیم عاشق بلبل و پروانه را

ز پیچ زلف تو پیچیده در سرم دودی   که سوخت جان ملائک ز رشک مجمر ما

تا بشاگردی عشق تو قدم فرسودیم   بوعلی را نه رسد دعوئ استادی ما

زدم بمشق جنون تخته بر سر مجنون   که دست سعی مریزاد کار فرما را

یاد فردوس برین تنگ دلم می سازد   تا غمت تنگ گرفته است در آغوش مرا

زبان غمزه یا مرغ دلها صحبتی دارد   که ابجد می شمارد منطق الطیر سلیمان را

بحد دارد دلم بر شکوه لاف صبر و طاقت را   نیارم با کمال عجز این اظهار قدرت را
ز بیم آن که هر سو سر کشد صد شعله از شکوه   بصد خون جگر پنهان کند دل آه حسرت را
ز خونین داغهائے من فلک را ز و فها یادا   ہر خوش آبے دو رنگی داده[ن] گلزار محبت را

ن داده ام گلزار محنت را (ح ـ ع و ف) ـ

نسیم لطف جاناں کم شد ای آه[۱] سحرگاهی ‌‌ ‌‌ مدد کن تا بجوش آریم دریاهای رحمت را

کرم کن ای مروت ره اگر یابی به بزم او ‌‌ ‌‌ نیاز نامرادی عرضه کن آں بی مروت را

چه عهدے بو عهد وصل جاناں هر جا بنازی ‌‌ ‌‌ دریغا مانه دانستیم ای دل قدر فرصت را

فدای رسم عادت سوز خود گردم که در عهدش ‌‌ ‌‌ عجب ویرانه دیدم سرای رسم و عادت را

مکن نسبت بغیرم[۲] در وفا آزار دیگر[۳] کن ‌‌ ۳۵ ‌‌ سراپا غیرتم مپسند بر من این مذلت را

بشرمت گر ز من بینایی سر زد از آن[۴] بگذر ‌‌ ‌‌ پریشان داشت طرح وضع صحبت مغز طاقت را

اگر این است مومن صحبت هجران من دیدم ‌‌ ‌‌ به ریش خوں خور و بیروں میا بگذار جرأت را

(ح-ع و م-ز-فرشته)

ب

سالها گشتیم در کوی کسی و ناکسی ‌‌ ‌‌ روی گرمی کس بما ننمود غیر از آفتاب

ت

عشق را گفتند قومی کار بیکاراں ولی ‌‌ ‌‌ هر کرا دیدیم در کوی محبت کار داشت

گل از آتش اگر روید عجب نیست ‌‌ ‌‌ زمین دوستی خوش سرزمینی ست

---

۱ باد (ف) - ۲ بعزم (ح-ع) - ۳ گوی (ح-ع) - ۴ ازاو (ف)

اگر دیدم قیامت ها عجب نیست   که کارم با قیامت آفرینی است

در مملکت عشق نه زورے نه جفائیست   آسودگی اینجاست بیائید که جائیست

آنکه از درد دلم کرده خبردار اینست   مست نازے که مرا ساخته ہشیار اینست
آنکه از نرگس پرعربده گرم نگاه   فتنه زا شد سبب گرمی بازار اینست

بنازمت که پے قتل عاشقاں ہمه روز   میان عشوه و ناز تو عہد و سوگند ست
بکوئے عشق سراسیمه مانده ام مومن   که ہر طرف نگرم راه جستجو بند ست

دوش دل با یار صحبتہائے دورادور داشت   عالم اشراقیاں از صحبت ما نور داشت
کبریائے عشق را نازم که بر درگاه شوق   پادشاہان و گدایاں را بیک دستور داشت

از خشک و تر دہر چه لذت چه ثمر یافت   آں را که دل سوخته و چشم ترے نیست
ہر فتنه که دیدم ہمه از کوے تو برخاست   در دہر بغیر از تو نگر فتنه گرے نیست

جز متاع دل عاشق که خریدار نیافت   بہر ہر جنس بد و نیک خریدارے ہست

پرسش خستۂ خود گر بکنی با کے نیست — غمگسارے چو غمت بر سر بیمارے ہست

(حدائق)

خوشم کہ در دل[۱] من عشق مدعا نگذاشت — مرا بہ پہلوئے شب ہائے تار وا نگذاشت
مرا بہ بوالہوسی ہائے خویش وانگذاشت[۲]

چہ آفتی تو کہ در عشق تو ہمہ عالم — محبت تو دو کس باہم آشنا نگذاشت
چہ آفتی تو ندانم کہ در جہاں امروز[۳]

کمینہ مرتبۂ عشق عشق مجنون ست — محبتے کم ازیں داخل محبت نیست

یک روزہ بود صحبت عالم ہمہ یک روز — زاں روئے قیامت بہ زباںہا ہمہ فرداست

مردیم و ہیچ کس بہ سر خاک ما نہ گفت — کاے مردہ شاد باش کہ فردا قیامت است

شدم از عشق تو دیوانہ و ایں می بایست — حسن پر شور ترا عشق چنیں می بایست
گفتۂ ہر کہ دم از عشق زند می کشمکش — جاں فدایت کہ مرا نیز ہمیں می بایست

---

۱ بر دل (فرشتہ) ۲ فرشتہ و محبوب الزمن - ۳ حدائق

بہ بزم بادہ چہ گویم کہ فتنہ ہا برخواست | چو حرف مستیٔ آں چشم فتنہ ساز گداخت

دولت وصلے بخواہم[1] دست داد | آسماں درخواب گویا بودہ است

د

بتو ہر کہ بودہ یک دم دل داغدار دارد | کہ بغیر داغ چندے ز تو یادگار دارد
اثر ملاحتِ او منِ زخم خوردہ دانم | کہ نمک فشاں ہمہ شب بدلم گذار دارد

عالم شگفت و خاطر ما ناشگفتہ ماند | گلزار مہر و باغ وفا ناشگفتہ ماند
شرمندہ ام کہ غنچۂ پژمردہ دلم | باصد ہزار سعیِ صبا ناشگفتہ ماند

شب جلوۂ او غیرت صد حور و پری بود | صد حور و پری بندۂ آں جلوہ گری بود
باجذب زلیخا نتوانست برآمد | یعقوب کہ مستغرقِ مہر پدری بود
مجنوں بہ رہ عشق نکو رفت ولیکن | از معرکہ بیروں شدنش بےجگری بود

با ما حریف ہم سفرے نیست ہر کسے | کیں کارواں در اول شب بار می کند

---

[1] بخواہم

زدور پرتو حسنت بہ دل چناں تابد ،، کہ آفتابِ جہاں تاب از آسماں تابد
توئی کہ حسنِ ترا کمتریں اثر اینست کہ آفتاب تو در مغزِ استخواں تابد

بیغمانِ چرخ را نازم چوں ہرجا رفتہ اند ہرکجا گرد ملالی بود برما رفتہ اند
از لطافت ہائے حسنت کارفرمایانِ ناز سرمہ را از تیرگی زاں چشمِ شہلا رفتہ اند

شعلۂ حسن ترا کار آں چناں بالا گرفت کاتشے درخرمن خورشید عالم تاب زد
ہر سحر گلشن بخون غلطید و بلبل خوں گریست زاں شبیخونہا کہ حسنت بر گل سیراب زد

کے بودہ کاں دو چشم دو صد چوں نکردہ اند شہرے بناز و عشوہ دگرگوں نکردہ اند
اے دل بہ ہوش باش کہ در شرع عاشقی رفع قلم ز مردمِ مجنوں نکردہ اند

فلک نہ داد مرادم چنانچہ دل میخواست ولے ز ہر سر مویت صد انتقام کشید

کردہ شوقے[1] بدلت خانہ مبارک باشد شمع من منصب پروانہ مبارک باشد

---

[1] شوخے بدلم - حدائق

به هوائے سر کوئے که تو میدانی و من ۸۰ شب برون آمدن از خانه مبارک باشد

(ید بیضا)

دلا بعادت پروانه گرد دوست مگرد　　بیا دگرم بآتش درآئے بازی چند

گره هائے دلم جز آه آتشبار نکشاید　　کسے را هم چو من یارب گره از کار نکشاید
ز صد لشکر ندیدم آن خرابی کز غمش دیدم　　الهی کاروانِ عشق جائے بار نکشاید

سودا و شورش دل دیوانه تازه شد　　با شمع باز نسبتِ پروانه تازه شد
زان لعل باده نوش و زان چشم مے فروش　　پیمانِ ما بساغر و پیمانه تازه شد

دل آشفتهٔ عاشق فراغت بر نمی تابد　　خرابستان رسوائی عمارت بر نمی تابد
سر مجنون نخواهد کسو نے جز موئے ژولیدهٔ　　تن شوریده کسو تهائے عزت بر نمی تابد

قسم به مهر و محبت که فتنه را جاں داد　　که دادِ دوست کشی آں دو چشم فتاں داد
کسے که از دم چشم تو خون مادر خواست　　بناز مش که سر و دے بیاد مستاں داد

ش

دہد صد کاروانِ مصر چیں بر باد در یک دم ۹۰ نسیمے کاورد باد صبا زاں جعد گیسویش

م

لذت ز درد، ذوق ز محنت گرفتہ ایم — ما داد دل خوشی ز ملامت گرفتہ ایم
ہمت گذاشت دامنِ خود را بما و رفت — ماخوش بایں که دامنِ ہمت گرفتہ ایم

بخود میلِ دلی از جانبِ دلدار فہمیدم — الٰہی خیر باشد یاریٔ از یار فہمیدم
خدارا بگذر اے راہی ز تربتِ مومنِ مسکیں — بوقتِ جاں سپردن حسرتِ بسیار فہمیدم

از دیدنت بہ فیض دو عالم رسیدہ ایم — اے دوست ما ترا نہ چو اغیار دیدہ ایم
صبر و سکوں کجاست بہ ملک نیاز و ناز — از حیرت است اگر نفسے آرمیدہ ایم
خوبے چناں کہ تا رخِ خوب تو دیدہ ایم — دیرینہ ہمدماں ہمہ از ہم بریدہ ایم
ہرگز خیالِ وصل بدل نگذر آمدہ است — عاشق بہ ناامیدیِ مومن نہ دیدہ ایم

معجزِ نارِ خلیل و فیضِ آبِ زندگی — از دلِ پُر آتش و از چشمِ پُر نم یافتیم

اے نگذری - (حدائق)

ن

ز آهِ من جهانے رو نهد هر دم براهِ من — دلیلے نیست راهِ عشق را جز برق آهِ من
پس از عمرے که سویت یک نگاهی اتفاق افتد — ز بیم خوئے تو از راه برگردد نگاهِ من

یک نفس مؤمن اگر از دوست غافل گشتهٔ — زیں گنه تا یک نفس باقی است استغفار کن

بریز خون من اے ساقی و بساغر کن — چه می شود تو هم از خونِ ما لبے تر کن

خرد گه از ره مهر و محبت سر برد بیروں — جنوں شاید سرے زیں راه پے رهبر برد بیروں
ز بے رحمی گرم صد بار خوں ریزد عجب دانم — که از دل حسرت آں دست و آں خنجر برد بیروں

ه

کم مبیں طفلِ نو آموز دلم را در عشق — مصحف مهر و محبت همه از بر کرده
اے صید دست و پا زده عذر گنه بخواه — گستاخئ بخدمت صیاد کرده

نکشود مرا کار ز سعی دل افگار — کارے بکشاید ز دل زار شکسته

زسینه تا رسدم بر لب و دهن ناله — هزار جا به نشیند ز ضعف تن ناله
ز ناله بے تو همین بست کز دل تیز — بگوش میرسد از خاک پیرهن ناله

بسمک البداة یا منک بدا بسم الله — اے به یاد تو ز صد درد دوا بسم الله
ذکر تو در همه حال دل مشتاق ترا[1] — آنچناں خوش که بود در آغاز دعا بسم الله
من و دل را سفر کعبهٔ عشق آمده پیش — هر که دارد سر همراهی ما بسم الله

ی

من چوں شوم به بزم طرب همدم کسے — دارم غم کسے که ندارد غم کسے
کردیم قطع یاری یاراں که پیش دوست — نامحرم است هر که بود محرم کسے

گذشت عمر گرامی به غفلتے عجبی — به غفلتے عجبی و بسرعتے عجبی
مقدمات که ترتیب یافت در همه عمر — نتیجه همه گردیده حسرتے عجبی

اے داغ تو چوں شدم سراپا آتش — ترسم که بسوزم چو دگر داغ نهی

---

[1] مشتاقاں را (حدایق)

رباعیات

دل پیش کسے رفت کہ بے ماش خوشست   غم خوش نبود ولے غم ماش خوشست
جاں می طلبد نمی دہم روزے چند   در جاں سخنے نیست تقاضاش خوشست

ایں عمر بیاد نو بہاراں ماند   ایں عیش لبیل کوہساراں ماند
زنہار چناں بزی کہ بعد از مردن   انگشت گزیدنی بہ یاراں ماند

از چرخ بر زمیں بلا می ریزد   رنج و غم و غصہ جا بجا می ریزد
گر حصۂ ما پیش رسد دور نیست   بر عضو ضعیف دردہا می ریزد

غم نیست کہ دل جنوں فاشی دارد   کز بے خبری خوش انتعاشی دارد
سودائے ترا بہر دو عالم نہ دہد   دیوانۂ ما عقل معاشی دارد

گر مرد رہی ولا ز محنت نہ جہی   مردانہ ز کف دامن ہمت نہ دہی

گر زیستن خویش چو مرداں خواہی منت نہ کشی از کس و منت نہ نہی

ہم آشوب جاں ہم بلائے دلی تو از فتنۂ حسن خود غافلی
بجا ہم نہ گشتی نکو آشنا بہ او گرچہ عمریست ہم منزلی

خصوصیات کلام میر صاحب کا کلام اس قابل ہے کہ اس کی خصوصیات پر تفصیل سے نظر ڈالی جائے ۔ اور ان کے پیشرو اور معاصر شعرا کے کلام کے ساتھ اس کا موازنہ کرکے فارسی شاعری میں اس کا درجہ معین کیا جائے ۔ لیکن جس طرح مولوی حالی نے مرزا غالب کی حیات میں لکھا ہے کہ عہد حاضر میں اہل ہند فارسی کے ذوق سے اتنے دور ہو گئے ہیں کہ اس قسم کی محنت پر یہی مثل صادق آئے گی کہ "مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزا نہ آیا"۔

لیکن حیات میر مومن کا مطالعہ کرنے والے ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ ضرور محسوس کریں گے کہ میر صاحب کوئی معمولی درجہ کے سخنگو نہیں تھے بلکہ ان میں ایک استادانہ شان پیدا ہوگئی تھی ۔

عبد الجبار خاں نے ان کے کلام کے نسبت یہ رائے ظاہر کی ہے :-

"کلام صاف و شستہ ہے ۔ استعارہ و کنایہ سے پاک ہے ۔ ہاں شاعرانہ تشبیہ و مبالغہ سے خالی نہیں ہے[1]"

---

[1] محبوب الزمن جلد دوم ص ۹۹۵

علی ابن طیفور میر صاحب کے کلام کو "بلاغت شعار" کہتا ہے[1]۔ عالم آرائے عباسی میں میر صاحب کے کلام کی نسبت "قصاید و غزل و رباعیات مرغوب" لکھا ہے۔ اور اس کے ایک قلمی نسخہ میں میر صاحب کی استادی اور عروض دانی کے ثبوت کے طور پر ان کے رسالہ عروض کا ذکر کیا ہے کہ :۔

"تا غایت دراں علم کسے مثل آں رسالہ تالیف ننمودہ[2]"

ان تمام رایوں سے ظاہر ہے کہ میر صاحب کی استادی اور کلام کی مقبولیت ان کی زندگی ہی سے مانی ہوئی تھی۔ ان کے کلام سے بھی ظاہر ہے کہ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ فن شعر پر محققانہ نظر رکھتے تھے۔ اور ان کی شاعری محض تکمیل ضابطہ یا فن دانی کی خاطر وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ دلی تڑپ اور عاشقانہ دردمندی نمودار ہے۔

---

[1] حدایق ورق ۱۸۸ ا۔

[2] عجیب بات یہ ہے کہ عالم آرائے عباسی کے نسخۂ مطبوعہ ایران میں رسالہ زبدۃ العروض کو میر صاحب کی تالیف ظاہر نہیں کیا ہے۔ لیکن مولوی قاسم علی بیگ صاحب اخگر کے کتب خانہ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا جس میں لکھا ہے کہ :۔

"قصائد و غزل و رباعیات مرغوب دارد۔ و در علم عروض رسالہ تصنیف نمودہ کہ تا غایت دراں علم کسے مثل آں رسالہ تالیف ننمودہ۔ و در صلاح و تقویٰ درجۂ عالی داشت" الی آخرہ

ممکن ہے کہ یہ عبارت الحاقی ہو۔ رسالۂ زبدۃ العروض کا ذکر اس کتاب کے صفحہ ۲۰۰ پر ملاحظہ ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ میر صاحب نے عروض پر کوئی اور رسالہ لکھا ہو جو اس وقت نایاب ہے۔

اگرچہ کلام مومن میں حافظ کی طرح رندی و بے باکی نمایاں نہیں ہے لیکن سوز اور جذبۂ شوق کی گہرائیوں کی وجہ سے اس کا پڑھنے والا ایک خاص وجدانی فضا میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ صاحبانِ دل اس کلام سے خاص طور پر متاثر ہوں گے۔

ساتواں حصّہ

تصرفات

میر مومن نے امیری اور فقیری دونوں حیثیتوں کو اپنے اندر اس خوبی سے جمع کر لیا تھا کہ اس کی نظیریں تاریخ عالم میں کم نظر سے گذرتی ہیں۔ دنیوی اعزاز و مراتب اور جاہ و جلال کی وجہ سے وہ عمر بھر حاجت مندوں اور ارباب سیاست وار کان حکومت کی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز بنے رہے۔ لیکن وہ محض ایک بڑی سلطنت کے پیشوائے اعظم اور با اقتدار دربار کے وکیل مطلق ہی نہیں تھے۔ ان میں چند ایسی خوبیاں اور خصوصیتیں بھی جمع ہو گئی تھیں جو امیروں اور صاحب دولتوں کو شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی ہیں۔ انھوں نے اس مقولہ کو پوری طرح ثابت کر دکھایا کہ ع

گر بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی

اخلاق و عادات ان کی سب سے اہم خوبی ان کے محاسن اخلاق میں پوشیدہ تھی۔ تواضع، انکسار، راست بازی اور دیانت داری ان کے کردار کا نمایاں جز تھا۔ ہر مورخ نے ان کی اس خصوصیت پر زور دیا ہے۔

مولف حدائق السلاطین لکھتا ہے :—

"بحسن اشفاق و مکارم اخلاق، و تقوی و پرہیزگاری، و امانت و دین داری، آراستہ بود۔ و باوجود کمال دانشمندی و کبر سن و اعتبارات بادشاہی بصفت تواضع و فروتنی و کثر نفسی و خوش خوئی اتصاف داشتہ دراں مبالغہ می نمود۔"

(ورق ۱۸۷ الف)

مولف عالم آرائے عباسی لکھتا ہے :۔

"بسیار فاضل و متدین و نیکو اخلاق" (صفحہ ۱۵۹)

مولف محبوب الزمن نے لکھا ہے :۔

"میر موصوف باوجود عہدہ وزارت و شان حکومت ہر کس و ناکس کے سامنے نہایت تواضع وخاکساری و کسر نفسی سے پیش آتا تھا۔ غرور و تکبر کو اپنے پاس نہایت حقیر و ناچیز جانتا تھا" (صفحہ ۹۹۱)

فیض رسانی

خوش اخلاقی اور منکسر مزاجی کے ساتھ دوسری اہم خصوصیت جس نے مخلوق خدا کو میر صاحب کا گرویدہ بنادیا ان کی طبیعت کا وہ رجحان تھا جس کی وجہ سے وہ ہر کس و ناکس کو کسی نہ کسی طرح فیض پہنچانا چاہتے تھے۔ فیض رسانی کا یہ مادہ دو طرح سے جلوہ پیرا ہوا۔ پہلے تو یہ کہ وہ ہر مسافر اور مستحق کی مدد اور سرپرستی کرتے تھے۔ جس کے کئی ثبوت گذشتہ فصلوں میں گذر چکے ہیں۔ مثلاً وہ ان کو ملازمت دلاتے' ان کے اعزاز میں اضافہ کراتے' غریب مسافروں کے قیام کے لئے خود اپنے صرفہ سے سرائیں بناتے اور ان کے کفن دفن تک کا خیال رکھتے۔

صاحب حدائق لکھتا ہے :۔

"واردان امصار و وافدان ہر دیار بوسیلۂ او از سلسلۂ قطب شاہیہ تمتع می یافتند۔"

صاحب عالم آرائے عباسی نے ان کی زندگی ہی میں لکھا تھا :۔

"ومستفیضین ہر دیار بوسیلۂ او از سلسلۂ قطب شاہیہ انتفاع می یابند" (صفحہ ۱۵۹)

میر صاحب کی اس فیض رسانی کی نسبت محبوب الزمن میں لکھا ہے :۔

"رعایا کے حقوق کی بڑی حفاظت کرتا تھا۔ ان کی جان و مال کی نگرانی میں پوری دلدہی کرتا تھا۔ رعایا کیا امیر و کیا فقیر سب خوشحال و فارغ بال تھے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں تھی .... میر کے زمانۂ وکالت میں ایران و توران کے ہزار ہا علما و فضلا دکن میں آئے اور میر کے توسل سے عہدہائے جلیلہ پر مقرر ہوئے حجاج و زائرین بھی جوق جوق آئے۔ میر کی سفارش سے مالامال و فارغ البال ہو کر اوطان مالوفہ کو روانہ ہوئے۔ اور میر موصوف مقامات عظام میں ہزار ہا روپیہ بھیجتا تھا۔ کربلائے معلیٰ و نجف اشرف و مشہد مقدس وغیرہ مقامات کے مجاورین و خوادم کے لئے وظائف مقرر کردئے تھے۔ سالانہ کل وظائف معتمد آدمی کے ہاتھ سے روانہ کرتا تھا۔" (صفحہ ۹۹۱ تا ۹۹۲)

میر صاحب کی دوسری قسم کی فیض رسانی ان کی ذاتی درس و تدریس تھی۔ باوجود امیر اعظم اور مقتدر عہدہ دار ہونے کے انھوں نے اپنے علم و فضل سے تشنگان علم کو سیراب کرنا ترک نہ کیا۔ وہ آخر تک برابر روزانہ درس دیتے رہے اور اس طرح ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑھتا گیا۔ حدائق میں لکھا ہے :۔

"در علوم منقول و معقول نقشِ مہارت بر صفحۂ ضمیر طلبۂ علوم می کاشت"
(ورق ۱۸۷ ب)

اسی تاریخ میں ایک اور جگہ لکھتا ہے :۔

"جمعے از طلبہ و فضلائے آں عصر در مجلسِ درس افادۂ او حاضر شدہ مستفید می شدند"
(ورق ۱۸۸ ا)

میر صاحب کے شاگردوں اور درس و تدریس کا تذکرہ بھی اس سے قبل گذر چکا ہے اس لئے یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

زہد و تقویٰ میر صاحب کی تیسری خوبی جو ان کو اہلِ دل اور اولیا مشہور کرنے کا باعث ہوی ان کی عبادت گذاری اور مذہبی دلچسپی تھی۔ مذہبی امور کی دلچسپی کے ثبوت تو ان کی تعمیر کرائی ہوی مسجدوں سے ملتے ہیں۔ اور ان کے عابد و زاہد ہونے کی نسبت تاریخوں کی شہادتیں کافی ہیں جو درج ذیل ہیں ۔

(۱) "در صلاح و تقویٰ درجۂ عالی داشت" (عالم آرائے عباسی صفحہ ۱۵۹)

(۲) "عالم و فاضل و مرتاض و سرآمد اہل دعوت بود" (ماہنامہ ورق ۳۰۵ ب)

۳ "در پاک طینتان صاف اعتقاد بود ...... بحسن ..... تقویٰ و پرہیزگاری و امانت و دین داری آراستہ بود" (حدائق السلاطین ورق ۱۸۷ الف ب)

علم و فضل زہد و تقویٰ اور اوقاتِ نیک کے ساتھ ساتھ میر صاحب بہت بڑے عالم، محقق، فلسفی اور محدث بھی تھے۔ جس کے ثبوت سے ان کی تصانیف معمور ہیں اور جن کا تذکرہ گذشتہ فصل میں گذر چکا ہے۔ ہر عالم کا باعمل ہونا اور ہر عابد کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن میر صاحب میں یہ سب خصوصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔

نجوم اور تسخیر اجنہ یہی سب محاسن کیا کم تھے! لیکن میر صاحب نے تو روحانیات، تسخیر اجنہ اور علوم نجوم میں بھی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اس طرح لوگ باطنی فیضان حاصل کرنے کے لئے بھی میر صاحب کے یہاں پہنچتے تھے اور ہر شخص بقدر اعتقاد

ان سے مستفید ہوتا تھا۔

ماہنامہ میں لکھا ہے :۔

"در فتح عزیمت و تسخیر جنات ید طولیٰ داشت ۔ سرآمد اہل دعوت بود"

(ماہنامہ ورق ۳۰۵ ب)

سحر باطل ستون

چنانچہ ماہنامہ میں مرقوم ہے کہ جب شہر حیدرآباد کی بنا ڈالی گئی اور محمد قلی کے دولت خانۂ عالی کی تعمیر ہونے لگی تو میر صاحب نے ایک پتھر کا ستون تیار کیا جس میں طلسم و تعویذ اور رقوم تکسیر کے ذریعہ سے بڑے بڑے جادو کو باطل کرنے کے اثرات پیدا کردئے گئے ۔ اس پتھر کو دروازۂ شاہی کے پیشگاہ میں نصب کرادیا تھا تاکہ اگر کوئی شخص کسی فاسد خیال یا مخفی ارادے کے ساتھ اس دروازے میں سے بادشاہ کے یہاں پہنچے تو اس کا سحر و عزیمت باطل ہو جائے ۔

جب اس پتھر کی خصوصیتوں کا عام طور پر علم ہوا تو شہر کے بیمار اور سقیم لوگ اس کے معائنے کے لئے آنے اور اپنی اپنی بیماریوں سے شفا پانے لگے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبیبوں کا بازار سرد ہو گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ تمام اطبائے شہر نے اتفاق کرکے ایک رات اس طلسمی پتھر کو وہاں سے اکھیڑا اور شہر کے باہر لیجا کر موضع الوال کی ایک باؤلی میں ڈالدیا ۔

لیکن اس پتھر نے باولی میں بھی اپنا اثر دکھانا شروع کیا چنانچہ جو لوگ اس میں غسل کرنے جاتے اپنی بیماریوں سے بھی شفا پا جاتے تھے ۔ آخرکار لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ سحر باطل ستون اسی باولی میں پوشیدہ ہے ۔ طبیبوں نے اس پتھر کو وہاں سے بھی نکال لیا ۔ اور کسی نامعلوم

جگہ پوشیدہ کر دیا۔ لیکن ماہ نامہ کی تالیف کے وقت تک بھی لوگ صحت کی اُمید میں اس باؤلی پر غسل کرنے جاتے تھے[1]۔

اجنہ پر حکومت

کہا جاتا ہے کہ میر صاحب کو تسخیر اجنہ میں بڑی مہارت حاصل تھی اور اس مخلوق پر بھی اُن کی حکومت تھی۔ گلزار آصفی میں لکھا ہے کہ اگرچہ میر صاحب کے متعلق اس قسم کے بہت سے قصے زبان زد خلایق ہیں لیکن کسی کتاب میں ان کا تذکرہ درج نہیں ہے۔ مولف گلزار آصفی کا بیان ہے کہ :-

دربارۂ عملیات کہ زبان زدِ خاص و عام و مشہور انام است در ہیچ تاریخ بہ نظر ایں احقر نہ آمد۔ و نیز زبانی اعتصام الملک بہادر ادام اللہ عمرہٗ عرض بیگی حضور پرنور کہ از جملہ سرآمد مورخان عہد اند متواتر بادراک و افہام عاصی ہمیں معنی در آمدہ در ہیچ تاریخ ذکر عملیات آنجناب بقلم نہ آوردہ لیکن بر زبان خلایق ایں دیار آنقدر مشہور و معروف است کہ مرتسم خاطر و مشہور انام کہ دل صداقت منزل باعتقاد کمترین و منفقین و محققین و غیر محققین علی العموم موافقین و مخالفین بتکذیب آں راضی نمی شود۔ بمعنی ایں کہ کلام الجمہور در نفس الامر مانند حدیثِ متواتر بے شائبہ کذب بیقینِ کلی است بلکہ در ہیچ ادراک شبہ نیست۔ الغرض آنچہ حکایات زبانی ہزارہا خلایق متقدمین کہ آنہا از آبا و اجداد خود ہا ہمیں سلسلہ کہ بطناً

[1] یہ واقعہ ماہنامہ میں تفصیل سے درج ہے اور اس کی فارسی عبارت کا ترجمہ ہم نے یہاں قلمبند کر دیا ہے۔

بعد بطنِ استحقاق وانق دارند - ونیز از بعضے بزرگانِ صداقت نشان کہ حکایات عجیب وغریب معائنہ شدہ ظاہرا بہ نظر وسماعت رسیدہ دلیل بر کرامت آنحضرت است[1]۔

اعتصام الملک کا بیان

اس طویل عبارت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اعتصام الملک عرض بگی جو اُس زمانہ کے بہت بڑے تاریخ داں تھے ان کا بھی یہی بیان تھا کہ میر صاحب کے خرق عادات، کرامتوں اور تسخیر اجنہ کے قصے کسی تاریخ میں درج نہیں ہیں البتہ حیدرآباد میں عام طور پر ان کی اتنی شہرت ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ میر صاحب کا معتقد ہو یا نہ ہو ان کے صحیح ہونے سے انکار نہیں کرسکتا۔

چنانچہ صاحب گلزار آصفی نے قطب شاہی عہد یعنے میر صاحب کی زندگی کا ایک قصہ لکھا ہے جس میں میر صاحب کے تعلقات شاہ جنات کے ساتھ اور اجنہ کی دنیا پر ان کی جو حکومت تھی اس کا حال درج ہے۔ چونکہ اس قسم کی باتوں پر آج کل کم اعتقاد کیا جاتا ہے اس لئے ہم یہاں مولف گلزار آصفیہ کی اصل فارسی عبارت کا اردو خلاصہ لکھدیتے ہیں :-

قیدِ اجنہ سے رہائی دلانا

معزز لوگ بیان کرتے ہیں کہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے منصبداروں میں سے دو بھائی میر مظفر وزیر کے یہاں متعین تھے۔ اور رات دن اس کے یہاں حاضر رہتے تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ سیر و شکار کی غرض سے موسیٰ ندی میں خیمہ زن ہوا۔ اور اہل لشکر بھی ندی کے کنارے اتر پڑے۔ جن میں

[1] گلزار آصفی مطبوعہ صفحہ ۶۰۸ —

یہ دونوں بھائی بھی تھے۔ لشکر کے لوگوں نے ندی میں جگہ جگہ چشمے کھود لئے تھے کیونکہ گرمی کا موسم تھا اور ندی میں پانی کی کمی تھی۔ اور ریتی کے یہ کنوئیں گز دو گز سے زیادہ گہرے نہ تھے۔ ایک روز وزیر کو دربار میں دیر تک ٹھہرنا پڑا۔ یہ دونوں منصبدار بھی ساتھ تھے۔ چھوٹا بھائی بہت بھوکا ہوگیا اور کچھ کھا پی کر دربار کو واپس ہونے کی غرض سے اپنے خیمہ میں آیا۔ درباری لباس اتارا ہی تھا کہ اس کے دامن سے سانپ کا ایک بچہ فرش پر گرا۔ منصبدار نے فوراً ایک لکڑی سے اس کو مار دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسکے جسم میں سوزش پیدا ہوگئی اور پکارنے لگا کہ میں جل گیا میں جل گیا۔ آخر کار بے قراری کے عالم میں قریب کے ایک چشمہ میں کود گیا۔ اور جب اس میں غائب ہوگیا تو لوگوں نے بڑے بھائی کو خبر کی۔ وہ بہت پریشان ہوا اور وزیر سے پورا ماجرا کہہ سنایا۔ وزیر نے کہا اگر کوئی آدمی اس کو چھپا دیتا تو اس کا تدارک ہوسکتا تھا۔ یہ معاملہ عالم بے اختیاری کا ہے جس میں میں مجبور ہوں تم کو چاہئے کہ میر مومن صاحب کی خدمت میں پہنچیں۔ میر صاحب اس وقت عبادت الٰہی کے لئے گوشہ نشین تھے۔ اس لئے ایک عریضہ لکھکر ان کے دولت خانہ پر (جہاں اب پرانی حویلی واقع ہے) روانہ کیا۔ میر صاحب نے تین چھوٹی چھوٹی ٹھیکریاں لیں اور کچھ لکھکر منصبدار کو عنایت کیں اور کہا کہ ایک ٹھیکری کو چشمے میں ڈالو۔ تمھارا بھائی نکل آئے گا۔ اگر دیر ہو جائے تو چار ساعت انتظار کرکے دوسری ٹھیکری ڈالو۔ یقیناً نکل آئے گا۔ اگر اس پر بھی اس کی برآمدی کے

آثار ظاہر نہ ہوں تو کافی تاخیر کے بعد تیسری ٹھیکری ڈالدو۔

بڑا بھائی حسب ارشاد چشمہ پر آیا۔ پہلی ٹھیکری ڈالی۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ دوسری بھی بیکار گئی۔ آخر تیسری ٹھیکری ڈالنے پر اس کا بھائی نظر آیا۔ لوگ اوپر نکال لائے۔ جب کچھ عرصہ بعد اس کو ہوش آیا تو اس سے واقعات دریافت کئے گئے۔ اس نے کہا کہ وہ سانپ کا بچہ شاہ جنات کا بھانجا تھا۔ میں جب گرمی سے بے قرار ہو کر چشمے میں کودا تو دو بدشکل قوی جوان مجھے پکڑ کر صحرائے لق و دق میں سے کھینچتے ہوئے ایک شہر میں لے گئے۔ وہاں کے بازار اور عمارتیں اور راستے نہایت پاک وصاف اور آراستہ ہیں۔ اور لوگ اپنے اپنے کام اور خرید و فروخت میں مصروف ہیں۔ جب مجھے بادشاہی محل میں لے گئے تو دیکھا کہ ہر شخص مستعد اور سامانِ جنگ سے تیار ہے۔ بادشاہ مرصع تخت پر شاہانہ لباس میں جلوہ فرما ہے۔ اور ارکانِ دولت اپنی اپنی جگہوں پر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ تخت کے قریب بادشاہ کی بہن سر برہنہ کھڑی کہہ رہی ہے کہ اے بھائی خدا نے تجھے بادشاہ بنایا ہے اس لئے انصاف سے کام لے اور میرے بچے کے خون کا بدلہ لیکر میرے دل کو ٹھنڈا کر اور خدا کو خوشنود۔

بادشاہ نے مجھے دیکھتے ہی حکم دیا کہ اس قاتل کو لیجا کر قتل کرو۔ حسب الحکم مجھے کشاں کشاں لے گئے اور تلوار چلانے والے ہی تھے کہ چوبدار اور ہرکارے دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ اس کی گردن نہ مارو۔ بادشاہ نے بلا بھیجا ہے۔

جب لوگوں نے مجھے بادشاہ کے روبرو پہنچایا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنی بہن کو سمجھا رہا ہے کہ اس شخص پر تیرے لڑکے کا خون کیونکر ثابت ہوتا ہے۔ جب کہ وہ ایک موذی جانور کی شکل میں اس کے دہن تک پہنچا۔ اس لئے اب معاف کر دے کیونکہ میر مومن صاحب اس کی سفارش کر رہے ہیں۔ بہن نے گریہ وزاری شروع کی اور کہا کہ اگر بدلہ نہ لیا تو میں بھی جان دیدوں گی۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر حکم دیا کہ اچھا اس کو لیجا کر مار ڈالو۔ مجھے پھر کشاں کشاں لے گئے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ مجھے جلد ہی مار ڈالیں تاکہ اس کشاکش سے چھوٹوں۔ دوسری دفعہ میرے مارنے کے لئے تلوار اٹھائی گئی تھی کہ ایک شتر سوار تیزی سے آیا اور شاہی حکم پہنچایا کہ اس انسان کو حاضر کریں۔ مجھے پھر اسی طرح بادشاہ کے روبرو لے گئے۔ اس وقت بادشاہ تخت سے نیچے اتر کر اپنی بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر سمجھا رہا تھا کہ اے بہن اس خیال سے باز آ کیونکہ میر مومن صاحب نے اس شخص کی دوبارہ سفارش کی ہے۔ لیکن بہن ہرگز راضی نہ ہوتی تھی اور جتنا سمجھایا جاتا وہ اتنی ہی بے التفاتی ظاہر کرتی۔ یہانتک کہ خبر آئی کہ شہر کی مشرقی جانب سے آگ بلند ہو رہی ہے۔ اور جنات کے چھوٹے بڑے سب مکان جل رہے ہیں۔

یہ سنتے ہی بادشاہ نے میرے محافظوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ میں اپنی اس کمبخت بہن کو کتنا سمجھاتا ہوں۔ نہیں سمجھتی۔ خود مرنا چاہتی ہے تو مرے نہ یہ کہ تمام خلقت جنات اور شہر تباہ ہو جائے۔ اس لئے اس شخص کو جلد لے جاؤ اور اسی چشمے میں ڈالدو۔ بادشاہ کا حکم سنتے ہی مجھے فوراً اس چشمے میں ڈالدیا۔ اس کے بعد کے حالات تو آپ

لوگوں کو معلوم ہیں۔

جب اس واقعہ کی خبر میر مظفر وزیر اور سلطان عبداللہ قطب شاہ اور عام لوگوں کو معلوم ہوی تو سب لوگوں نے تعجب کیا کہ میر صاحب کو کتنی قدرت حاصل ہے! اور یہ واقعہ اب تک حیدرآباد کے خواص و عوام میں مشہور رہے حالانکہ یہ زمانہ پیشین میں وقوع پذیر ہوا تھا۔

میر محمد مومن کی تسخیر جنات کا یہ واقعہ گلزار آصفی کے صفحات ۶۱۳ تا ۶۱۵ پر مندرج ہے ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ اس کا خلاصہ اُردو میں لکھا ہے۔ اس میں ایک بات تاریخی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ یعنے اس کی رو سے میر صاحب عہد عبداللہ قطب شاہ میں زندہ تھے۔ حالانکہ جیسا کہ اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے وہ سلطان محمد سے تقریباً ایک سال قبل فوت ہو چکے تھے۔ ممکن ہے کہ مرور ایام کی وجہ سے عہد محمد قطب شاہ کے واقعہ کو لوگوں نے اس کے فرزند عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ سے منسوب کر دیا۔ اور ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی کیونکہ سلطان محمد نے بہت کم عرصہ حکومت کی اور اس کے فرزند کا زمانہ حکومت نصف صدی سے زیادہ چلتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کے لوگ اور خود مورخین بھی سلطان عبداللہ کے پیشرو سلطان محمد اور اس کے جانشین سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے زمانوں کو بھول گئے اور اکثر و بیشتر ان دونو بادشاہوں کے واقعات کو سلطان عبداللہ ہی کے عہد سے منسوب کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ طویل ہونے کے علاوہ کئی امور کے لحاظ سے دکن کی تاریخ میں نہایت اہم اور مصروف عہد سمجھا جاتا ہے۔

تسخیر جنات کا ایک اور ثبوت

تسخیر جنات کا ایک اور واقعہ دائرہ کی تعمیر کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ دائرے کو مقدس بنانے کے لئے کربلائے معلیٰ سے جو خاک پاک منگائی گئی وہ میر صاحب نے اپنے ماتحت اجنہ ہی کے ذریعہ سے منگوائی اور دائرہ میں بچھوائی تھی۔

یہ واقعات تو میر صاحب کی زندگی سے متعلق تھے۔ لیکن ان کی اتنی شہرت ہوی لہٰذا ان کی وفات کے بعد بھی لوگ ان کی قوتوں کے قائل رہے اور ان کی فیض رسانی اور کرامتوں کے دل سے معتقد رہے چنانچہ اس قسم کی بہت سی کرامتیں اب بھی حیدرآباد میں زبان زد خلائق ہیں

کرامتیں

اور چند خود گلزار آصفی میں بھی درج ہیں۔ چنانچہ ہم پہلے گلزار آصفی ہی سے میر صاحب کی ایک کرامت پیش کرتے ہیں جس کی نسبت لکھا ہے کہ یہ نواب میر عالم بہادر کا چشم دید واقعہ ہے۔ صاحب گلزار آصفی لکھتے ہیں:۔

میر عالم کا چشم دید واقعہ

یہ واقعہ میر عالم کی دیوانی کا ہے اور خود میر عالم کے علاوہ ہم سبھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔ میر شہسوار علی ایک پریشان روزگار سید صحیح النسب تھے جو ہمیشہ سبز پوش رہا کرتے تھے کیونکہ ذی مقدور لوگ محرم میں ماتمی سبز لباس انہی کو دیدیا کرتے تھے اور یہ اس کو سال بھر پہنتے رہتے۔ خود میر عالم ان کو پانچ روپیہ ماہوار دیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ اہل وعیال کے لئے کافی نہ ہوتے لیکن صاحب غیرت تھے اس لئے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک وقت آدھی رات گئے دائرہ میر مومن صاحب کے راستہ سے اپنے مکان کو آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دائرہ میں کوئی

نہیں البتہ ایک شخص بزرگ منش عربی لباس پہنے شان وشوکت کے ساتھ اپنے گنبد کے دروازہ پر کھڑا ہے مجھے دیکھتے ہی آواز دی کہ "میر شہسوار علی ادھر آ۔"

مجھے یقین ہوگیا کہ یہ خود میر مومن صاحب ہیں۔ بڑے اشتیاق کے ساتھ نزدیک گیا اور کہا کہ

"پیرو مرشد۔ خدا نے آج کی رات کو غلام کے لئے شب معراج بنا دیا ہے کہ آپ کے قدم میسر آئے۔"

انھوں نے فرمایا کہ "تمھارے اخراجات کیسے چل رہے ہیں؟"

میں نے عرض کیا کہ "قبلۂ عالم باوجود قدیم دوستی کے میر عالم ماہانہ پانچ روپیے دیتے ہیں۔ اس میں بڑی مشکل سے بسر ہوتی ہے۔"

فرمایا۔ "اگر تم کو ایک روپیہ یومیہ مل جائے تو کافی ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "اے حضرت۔ بس بہت ہے۔ پھر کبھی زمانہ کے شکوہ وشکایت میں منہ نہ کھولوں گا۔"

یہ سنکر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالکر سلطان محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد کے وقت کا ایک روپیہ نکالا اور مجھے عنایت کرکے فرمایا کہ :۔

"اس روپیہ کو اپنے قلمدان یا صندوقچہ میں احتیاط و امانت کے ساتھ مقفل رکھو۔ اور لال کپڑے یا لال کاغذ میں باندھ کر الگ رکھنا تاکہ دوسرے روپیوں کے ساتھ نہ مل جائے۔ انشاءاللہ اس روپے کے ساتھ ہر روز دو روپے تمھیں ملتے رہیں گے۔ ان دو روپیوں کو اپنے

خرچ میں لاتے رہو اور اس روپے کو بہت حفاظت سے رکھو۔ اگر میرا دیا ہوا یہ روپیہ کھو جائے تو پھر کوڑی بھی نہ ملے گی۔"

غرض مجھ پریشان حال کے ہاتھ میں روپیہ دیکر رخصت فرمایا۔ میں نے اسی طرح حسب ارشاد لال کپڑے میں باندھ کر اپنے کپڑوں کے صندوقچہ میں مقفل کر دیا۔ دوسرے روز جونہی کہ میں نے صندوقچہ کے خانہ میں ہاتھ ڈالا دو روپے اور نظر آئے جو سکۂ رائج الوقت کے تھے۔ میں نے ان کو لے لیا اور روز اسی طرح دو روپے لینا اور خرچ میں لا لینا۔ جب لوگوں نے میری مرفہ الحالی اور تبدیلی لباس کو دیکھا تو میرے متعلق میرے لڑکوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ اور میر عالم تک یہ خبر پہنچا دی۔ وہ مدار المہام تھے۔ مجھے بلا بھیجا اور میر صاحب کا دیا ہوا روپیہ دیکھ کر اس کو بوسہ دیا اور کہا کہ "لو مبارک ہو اس کو احتیاط سے رکھو"۔

جب تک شہسوار علی زندہ رہے وہ روپیہ ان کے یہاں موجود رہا ان کے انتقال کے بعد روپیہ کو بہت ڈھونڈا گیا لیکن پتہ نہ چلا۔ یہ معاملہ مولف گلزار آصفیہ کا چشم دید اور ان کے زمانہ میں مشہور آفاق تھا۔[1]

ہمت یار جنگ کے جنون کا علاج

گلزار آصفیہ میں میر صاحب کی باطنی عاملانہ قوتوں کا دوسرا واقعہ ہمت یار جنگ کے جنون سے متعلق درج ہے لکھا ہے:-

ایک واقعہ جو دانایانِ روزگار کے لئے باعثِ حیرت لیکن میرا چشم دید ہے

---

[1] دیکھو گلزار آصفیہ ۶۱۶ و ۶۱۷ —

یہ ہے کہ ہمت یار جنگ ایک قدیم خاندانی امیر ہیں جو نمازی، متقی، اوراد وظائف کے پابند اور عقلمند اور قلعہ ظفر گڑھ وابراہیم گڑھ کے قلعہ دار ہیں۔ ایک روز قلعہ میں اپنے مکان کے بالاخانہ میں بیٹھے ہوئے صحرا وسبزہ زار کی سیر و تماشا میں مصروف تھے کہ دفعتاً ایک سفید رنگ کی بکری نظر آئی جو زرتار جھول اور طلائی زیور سے آراستہ تھی اور ناز و کرشمہ کے ساتھ قلعہ کی دیوار کے نیچے پھر رہی تھی۔ وہ اس کے حسن ولباس پر فریفتہ ہوکر پا پیادہ قلعہ کے باہر آئے اور اس کے نزدیک پہنچے۔ وہ آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی اور آخر کار یکایک گل و یاسمن کا ڈھیر بن گئی۔

یہ دیکھتے ہی نواب بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ لوگ پالکی میں ڈال کر قلعہ میں لے آئے۔ لیکن وہ ایک عرصہ تک بے ہوش رہے۔ اور جب ہوش آیا تو رونے لگے، کھانا پینا ترک کر دیا۔ اور بار بار اس جگہ جانے کا قصد کیا۔ یہاں تک کہ لباس کا بھی خیال نہ رہا۔ ان کے بھائیوں اور دوستوں نے قلعہ کے اطراف و جوانب کے ہندو اور مسلمان اہل دعوت اور عاملوں کو بلاکر رجوع کیا اور سفلی عملوں سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ دیوانگی اور گریہ وزاری روز بروز بڑھتی گئی۔

آخر کار مجبور ہوکر ایک پالکی میں بٹھا کر رسیوں سے باندھا گیا اور شہر کو لے آئے۔ یہاں اہل دعوت و عملیات اور پیرزادوں اور فقیروں سے کام لیا گیا

اور پچکاروں کے تجویز کئے ہوئے صدقے بھی دئے گئے غرض بہت کچھ خرچ کیا گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخرکار لوگوں کی رائے سے پالکی میں بٹھا کر میر مومن صاحب کی قبر پر لے گئے۔ جب گنبد کے قریب پہنچے تو نواب نے اندر داخل ہونے سے انکار کر دیا اور بھاگنے لگے۔ بہرحال بڑی مشکل سے پکڑ کر اندر لے گئے۔ نواب نے گریہ و زاری اور بے قراری شروع کی اور بھاگنا چاہا۔ لوگوں نے پکڑ کر میر صاحب کی قبر کے قریب بٹھایا۔ یکایک ان کے تمام بدن میں لرزہ شروع ہوا اور وہ پکارنے لگے کہ میں جاتا ہوں۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ کچھ عرصہ بعد بے ہوش ہو گئے۔ اور چار ساعت کے بعد جب ہوش آیا تو لباس طلب کیا اور کہنے لگے کہ مجھے برہنہ کیوں کر دیا گیا ہے۔ لوگوں نے قبر پر سے وار کر پانی دیا تو رغبت سے پی گئے اور اس کے بعد سے کبھی جنون کی حرکت ظاہر نہ کی[1]۔

ایک حبشی کا قصہ

صاحب گلزار آصفیہ نے اپنا ایک اور چشم دید واقعہ لکھا ہے جس کا اردو خلاصہ یہ ہے:۔

محمد نعیم الدین خاں بہادر کے یہاں ایک حبشی جوان تھا۔ جس کی طبیعت یکایک اعتدال سے متجاوز ہوگئی اور لوگوں کو گالیاں دینا اور پتھر مارنا شروع کیا۔ بہت کچھ علاج کیا گیا لیکن کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ آخرکار میر صاحب کی قبر پر

---

[1] دیکھو گلزار آصفیہ صفحہ ۶۱۷ تا ۶۱۸ ـــ

لے گئے۔ گنبد کے اندر لے جانے کی جتنی کوشش کی جاتی تھی اتنا ہی بھاگتا تھا۔ مجبوراً طاقت استعمال کر کے اس کو اندر لے گئے اور مزار کے قریب بٹھایا۔ اور قبر پر سے وار کر پانی پلایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحتمند ہوگیا اور پھر دیوانگی کی کوئی حرکت نہ کی۔[1]

ان قصوں کے سلسلہ میں صاحب گلزار آصفیہ نے لکھا ہے کہ :۔

"الحال معمول است کہ ہر کس را کہ سایۂ جن یا شیاطین شدہ باشد و او حرکات جنون کند چند روز بر قبر شریف میر صاحب موصوف بردہ آب از بالائے قبر آنحضرت تصدق کردہ بنوشانند سایہ و آسیب میگزرد۔" ص ۶۱۸

پانی کے کوزے اور صراحیاں

یہ تو ٹھیک سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ لیکن پوری ایک صدی گذرنے کے بعد بھی یہی عمل اب تک جاری ہے۔ چنانچہ اب بھی میر صاحب کی قبر کے اطراف پانی کے کوزے اور چھوٹی بڑی صراحیاں روزانہ دھری نظر آتی ہیں۔ اور لوگ بڑی عقیدت سے بیماروں کو پانی پلاتے ہیں۔ غرض میر صاحب کا یہ فیضان ان کی وفات کے بعد بھی (یعنے سوا تین سو سال سے) برابر جاری ہے اور شاید ہمیشہ جاری رہیگا۔

جدید مثالیں

مولف کتاب ہذا کے ایک دوست جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہیں اور ملک کے لائق اور فاضل ادیبوں میں سمجھے جاتے ہیں بیان کرتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے بچپن میں ان کو میر صاحب کی قبر پر لے جاکر سنگ مزار کو چھوایا تھا۔ اور کہا تھا کہ

[1] گلزار آصفیہ ۔ صفحہ ۶۱۸ ۔

جو بچہ میر صاحب کی قبر ایک وقت چاٹتا ہے عمر بھر اس کا ذہن تیز رہتا ہے اور قوت گویائی بھی ترقی کرتی ہے۔

کچھ روز پیشتر مولف کتاب نے خود دیکھا کہ دائرہ میں ایک برات باجے تاشے کے ساتھ داخل ہوی۔ لوگ ایک بچہ کو جو غالباً بسم اللہ کا دولہا تھا پھول پہنائے ہوے لے آئے۔ اور میر صاحب کی قبر پر سے وار کر پانی پلایا۔

میر صاحب کے حالات کی تلاش کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر اصحاب نے بجائے تاریخی معلومات کی فراہمی کے کرامتوں اور تصرفات ہی کے قصے بیان کئے۔ اور یہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو قلمبند کرنا موجب طوالت ہوگا اس لئے یہاں صرف اس امر کا اظہار کافی ہے کہ حیدرآباد کے اکثر قدیم الخاندان شیعہ اور سنی اصحاب میر صاحب کے بے حد معتقد ہیں اور دل سے ان کو ولی اور صاحب تصرفات مانتے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اکثر سنی معتقدین خود میر صاحب کو بھی سنی ہی سمجھتے ہیں

فتح کا پھریرا میر صاحب کے تصرفات کا بیان ختم کرنے سے قبل ان کے بنائے ہوئے ایک جھنڈے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ دبیز سفید کپڑے کا ایک گاؤدم لانبا پھریرا ہے جس کا طول پانچ گز اور عرض تین گز ہے۔ اور اب بھی بوسیدہ حالت میں میر صاحب ہی کی اولاد میں ایک صاحب میر محمد مومن عرف سید بادشاہ کے یہاں موجود ہے جو محلہ سلطان شاہی میں رہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایک وقت جب قطب شاہی فوجیں جنگ میں متواتر شکست کھا رہی تھیں تو بادشاہ نے میر صاحب سے باطنی مدد کی استدعا کی چنانچہ میر صاحب نے یہ پھریرا تیار کیا۔ اس میں حاشیہ پر اور درمیان میں بھی آیات قرآنی اور پنجتن پاک کے نام نہایت خوش خط ثلث میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور بقیہ تمام جگہ تعویذوں اور ہندسوں سے پر کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ پھریرا میدان جنگ میں نصب کیا گیا تو بادشاہ کو بہت بڑی فتح حاصل ہوی۔

آٹھواں حصّہ

پس ماندگان

میر صاحب کے اکلوتے فرزند میر مجدالدین محمد کا تذکرہ گذر چکا ہے[1]۔ وہ اپنے ضعیف باپ کی زندگی ہی میں انتقال کر چکے تھے۔ اس لئے میر محمد مومن کے حقیقی پس ماندگان اصل میں مجدالدین کی اولاد ہی تھی جس میں ایک دختر اور تین فرزند شامل تھے۔ دختر مجدالدین محمد کی غالباً پہلی اولاد تھی اور میر صاحب کی زندگی ہی میں مرزا بیگ فندرسکی کے بھتیجے مرزا حمزہ استرآبادی سے بیاہ دی گئی تھی۔ مرزا بیگ وہی سلحدار ہیں جنکی دی ہوئی کتاب شرح گلشن راز پر سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے قلم سے تحریر لکھی تھی[2]۔

مرزا حمزہ سلطان محمد کے عہد میں سنہ ۱۰۳۰ھ کے قریب استرآباد سے حیدرآباد آئے اور سلک مجلسیان شاہی میں شامل کئے گئے۔ چونکہ شرافت نسب کے علاوہ صفات راستی و امانت و دیانت سے متصف تھے[3] اس لئے میر صاحب نے بڑی سرپرستی کی اور ساٹھ ہزار ہون کی جاگیرات دلوا کر اپنی پوتی سے شادی کر دی۔ اور جہیز میں اتنی دولت دی کہ مرزا حمزہ امرائے سلطنت میں شامل ہو گئے۔ حدیقہ میں لکھا ہے کہ :-

"بتقریب دامادی غفراں پناہ میر مجدالدین محمد ولد میر مومن بہ مرتبۂ امارت رسید[4]"

جب رمضان سنہ ۱۰۴۴ھ میں شریف الملک ملا محمد تقی تفرشی سرخیل (سپہ سالار) شاہی فوت ہو گئے تو ۲۴ ذیحجہ سنہ ۱۰۴۴ھ کو سلطان عبداللہ نے مرزا حمزہ کو اس عہدہ پر فائز کر دیا۔ لیکن شاید مرزا حمزہ اور علامہ ابن خاتون میں صفائی نہ تھی انھوں نے یہ مشہور کیا کہ مرزا فن استیفا و قلمرانی و عملداری سے ناواقف ہیں۔

---

[1] دیکھو اس کتاب کا پانچواں حصہ صفحات ۱۶۱ تا ۱۷۲۔ [2] دیکھو اس کتاب کے صفحات ۱۴۸ و ۱۴۹۔

[3] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ٠٠ ۔ [4] دیکھو حدیقہ احوال سنہ ۱۰۴۸ھ ۔

اسلئے دیانتدار اور راستباز ہونے کے باوجود برہمنوں کے زیر اثر آگئے ہیں۔ آخر کار تین ماہ دس روز کے بعد ۳ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ کو ابن خاتون نے مرزا حمزہ کو معزول کرکے مرزا روزبھان اصفہانی کو سرخیل بنادیا۔[1]

لیکن بادشاہ (میر مومن صاحب کی قرابت کے خیال سے) مرزا حمزہ کا خیر خواہ اور قدردان تھا اسلئے اس نے اس نقصان کی تلافی کی خاطر مرزا کو فیروز خان ترک کی ایک لاکھ ہون کی جاگیرات عطا کردیں۔ کیونکہ فیروز خان اسی زمانہ میں فوت ہوا تھا۔ اسکے علاوہ مرزا کو اپنے مجلسیوں کے زمرہ میں بھی شریک کرلیا۔

۱۰۴۲ھ میں سلطان عبداللہ نے مرزا حمزہ کو اس وفد کے استقبال کیلئے روانہ کیا جو شہزادی خدیجہ سلطان شہربانو بیگم کو سلطان محمد عادل شاہ کے ساتھ بیاہنے کیلئے بیجاپور سے آیا تھا۔ اسکے دو سال بعد ۱۰۴۴ھ میں خداویردی سلطان کو ولایت مرتضیٰ نگر سے واپس بلاکر مرزا حمزہ کو وہاں کا سرلشکر مقرر کیا اور سرداروں اور خاصہ خیل کے ساتھ روانہ کیا۔ کیونکہ مرزا پہلے بھی مرتضیٰ نگر میں رہ چکے تھے۔

سرخیلی جیسی خدمت کے بعد مرزا حمزہ کو قلعہ گولکنڈہ کی حوالہ داری سپرد کی گئی۔ یہ یہ پہلی خدمت سے بھی اہم تھی۔ کیونکہ قلعہ گولکنڈہ قطب شاہیوں کی جملہ قوت اور دولت کا مرکز اور مخزن تھا۔ اور اس کا حوالہ دار ایک ایسا ہی شخص بن سکتا تھا جس کی دیانت اور وفاداری پر سلطنت کو پورا اعتماد ہو۔

افسوس ہے کہ یہ وفادار امیر اپنی آمد حیدرآباد اور شادی کے بارہ چودہ سال بعد ہی ماہ شوال ۱۰۴۸ھ میں مرض اسہال سے انتقال کرگئے۔ اور چونکہ میر صاحب کے پوتر داماد

[1] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹۶ ـ

تھے اس لئے انہی کے دائرہ میں دفن کئے گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حمزہ لاولد فوت ہوئے۔ کیونکہ مورخ نے ان کے انتقال کے بیان میں ان کے بھتیجے کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا مرزا حمزہ کے وہی ایک وارث تھے۔ اس کے الفاظ ہیں :-

"اعلیحضرت خاقان پسر برادر اورا کہ از استر آباد آمدہ بود درسلک سلحدار محلداران مقرر داشتند۔ وحوالہ داری قلعہ را بہ بعضے از ملازمان وغلامان رجوع فرمایند"

(حدیقۃ احوال ۱۰۴۰ھ) ۔

مرزا حمزہ کی بیوی یعنے میر صاحب کی پوتری یا تو اپنے شوہر سے قبل ہی انتقال کر گئی تھیں۔ یا اگر ان کے بعد زندہ رہیں تو دو سال کے اندر ہی یعنے ۲۳ رجمادی الاول ۱۰۵۰ھ سے قبل فوت ہوئیں۔ کیونکہ اس تاریخ کو سلطان عبداللہ قطب شاہ نے میر صاحب کی جاگیرات کو جب ان کے ورثا کے نام بذریعہ فرمان بحال کیا تو اس میں میر صاحب کے صرف نبیروں کا ذکر کیا ہے جس کی تفصیل آئندہ درج کی جائے گی۔ غرض مجدالدین محمد کی یہ دختر بھی جو ان کی اولاد اکبر تھی انہی کی طرح جوانمرگ ثابت ہوی کیونکہ ۱۰۵۰ھ سے قبل فوت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس وقت اس خاتون کی عمر پینتیس سال بھی نہ ہونے پائی تھی۔

میر صاحب کے نبیرے میر محمد جعفر

میر مجدالدین کے بڑے فرزند کا نام میر محمد جعفر تھا۔ سلطان عبداللہ نے اپنے مذکورہ فرمان میں دو دفعہ انہی کا نام لیا ہے۔ اس فرمان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد جعفر نے اپنے بہنوی مرزا حمزہ کے انتقال کے بعد

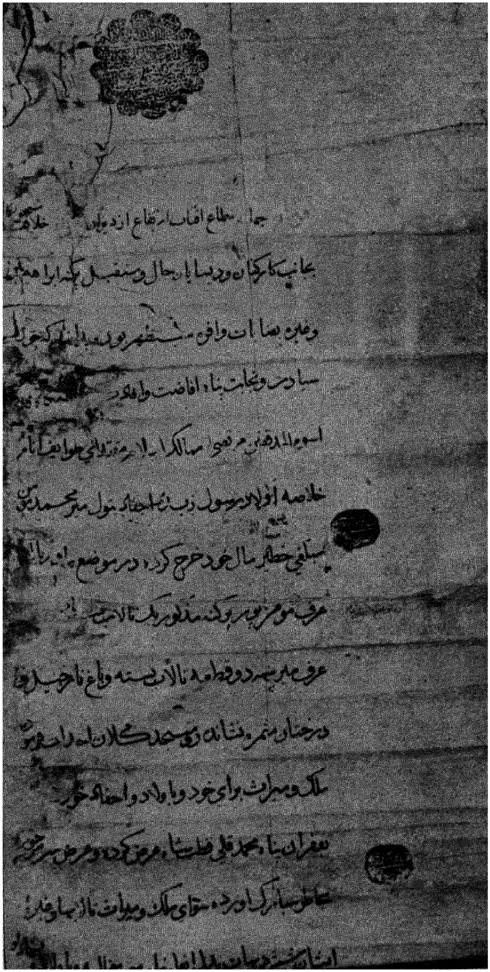
میر مومن صاحب کی جاگیرات اور املاک کی وراثت کی کارروائی اٹھائی اور بادشاہ سے استدعا کی کہ یہ تمام جائداد میر صاحب کے نبیروں کے نام پر بحال کی جائے ۔ اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان عبداللہ کا وہ فرمان نقل کر دیا جائے جو میر محمد جعفر کی کوشش سے جاری ہوا تھا اور جس کے بعض اقتباسات ہم نے اس کتاب میں مختلف جگہوں پر نقل کئے ہیں[1]۔

فرمان عبداللہ قطب شاہ

فرمان جہاں مطاع آفتاب ارتفاع از دیوان ہمیوں خلافت مشحون بجانب کارکنان و دیہایان حال و مستقبل پرگنہ ابراہیم پٹن وغیرہ بعنایات وافرہ مستظہر بودہ بدانند کہ چوں سیادت و نجابت پناہ افاضت و افادت دستگاہ، قدوۂ اسوۃ المدققین، مرتضیٰ ممالک اسلام، مقتدائے طوایف انام، خلاصۂ اولاد رسول، زبدۂ احفاد بتول، میر محمد مومن مبلغے خطیر مال خود خرچ کردہ در موضع راوریال عرف مومن پور پرگنۂ مذکور یک تالاب بستہ و در مصطفیٰ یاد عرف میر پیٹھ دو قطعہ تالاب بستہ و باغ نارجیل و درختان مثمرہ نشاندہ و مسجد کلاں احداث فرمودہ ملک و میراث برائے خود و باولاد و احفاد خود ...... بغفران پناہ محمد قلی قطب شاہ عرض کردہ و عرض میر مرحوم بخاطر مبارک آوردہ سوائے ملک و میراث تالاب ہا وغیرہ ایشاں، شش دیہات بدل انعام بنام میر معز الیہ و باولاد و احفاد او مرحمت کردہ دادہ بودند بعد ازاں میر مرحوم رحمت خواست ۔ میر جعفر وغیرہ نبیرہائے او بحضور عالی استدعا نمودہ بجا ...... مبارک آوردہ حکم عالی متعالی صادر گشتہ کہ

---

[1] یہ فرمان مولوی میر عباس علی صاحب کے یہاں محفوظ ہے ۔



میر صاحب کی جاگیرات سے متعلق عبداللہ قطب شاہ کا فرمان

دسبند تالاب ہا محصول باغ و دیہات وغیرہ از استقبال غرۂ جمادی الثانی سنہ احدی او اربعین الف سال بسال در وجہ انعام باولاد و احفاد میر مرحوم الیٰ ماتوالدو او تناسل مرحمت فرمودیم۔ و بارز مواضع مزبور را در وجہ انعام نبیرہ ہائے میر مذکور مجری دانستہ جاری و ممضی و مستمر دارند۔ و محصول حاصلات دسبند تالاب ہا و ملک و میراث و مواضع مسطور بتصرف میر محمد جعفر وغیرہ نبیرہ ہائے میر مرحوم واگذارند۔ و از کل تکلیفات دیوانی و کل قانون قدیمی و جدیدی اسمی و رسمی معاف دانستہ متعرض و مزاحم حال نگروند۔ و ہر کس از راہ طمع بخلاف مضمون ایں فرمان عنایت عنوان تبدیل و تحریف جایز دانستہ بمواضع مزبور انعام میر سابق الذکر مزاحم شود بغضب و سخط آفریدگار گرفتار آید۔ و از شفاعت شفیع روز جزا محمد مصطفیٰ صلعم بے نصیب و بے بہرہ گردد۔ فمن بدلہٗ بعد ما سمعہٗ فانما اثمہٗ علی الذین یبدلونہٗ و بہیچ وجہ من الوجوہ مزاحم نشوند۔ و ہر سال عذر فرمان مجدد نکنند و ہمیں فرمان ابدالآباد رواں دارند۔ و تعلیق نوشتہ گرفتہ آمد فرمان ہمایوں یاد دہند و بحکم فرمان عالی روند۔

بتاریخ ۲۲ ر ماہ جمادی الاول سنہ ۱۰۵۰ھ

موضع راوریال — موضع مصطفیٰ آباد — موضع مامریلی — موضع جرلہ پلی

پرگنہ ابراہیم پٹن — عرف میر پیٹھ — حویلی حیدرآباد

موضع اوپل — موضع کنگرہ

حویلی حیدرآباد — حویلی حیدرآباد

اس فارسی عبارت کے نیچے تلنگی میں بھی لکھا گیا ہے۔ اور تاریخ و سنہ کے محاذی غالباً سلطان عبداللہ کے دستخط ہیں اور حاشیہ پر چار پانچ چھوٹی چھوٹی مہریں ہیں جن میں سے ایک غالباً عبداللہ قطب شاہ کی ہے اور دوسری شاہ کمال الدین الحسینی کی۔

غرض میر محمد جعفر نے اپنے والد اور دادا کے انتقال کے ۱۶ سال بعد ان کے ورثہ پر پوری طرح سے قبضہ حاصل کیا۔ فرمان سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کے پس ماندگان غرۂ جمادی الثانی ۱۰۴۱ھ سے اس جائداد سے محروم ہو گئے تھے اس لئے بادشاہ نے ان کے قبضہ کو اسی تاریخ سے بحال قرار دیا ہے۔ اس کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوئی کہ میر صاحب کے انتقال کے صرف سات سال بعد ایسے کیا واقعات پیش آئے تھے کہ ان کی جاگیرات وغیرہ ان کے پس ماندوں کے قبضہ سے نکل گئیں ممکن ہے کہ ان خاتون و حرز احمرہ کے ناخوشگوار تعلقات اسکا باعث ہوں۔

میر محمد جعفر کی لیاقت

میر محمد جعفر کو ان کے دادا اور والد نے اچھی تعلیم دی تھی۔ چونکہ یہ فرزند اکبر تھے اس لئے ان میں باپ اور دادا کی نیکیاں اور لیاقت کی جھلکیں ضرور نمودار تھیں۔ چنانچہ علی ابن طیفور بسطامی نے اپنی تاریخ حدائق السلاطین میں ان کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیک اور خوش خو ہونے کے علاوہ اچھے ادیب اور لائق و فاضل بھی تھے۔ اور اپنے والد کے دیوان کو مرتب کر کے اس پر منشیانہ دیباچہ بھی لکھا تھا۔ تاریخ میں لکھا ہے۔

"و پسر او سید حمیدہ سیر فضیلت گستر سید جعفر بعد از فوت والد عالی قدر اشعار متفرقہ او را جمع ساختہ و دیباچہ منشیانہ براں نگاشتہ"[1]

---

[1] دیکھو حدائق السلاطین، ورق ۱۸۱ ا۔

میر محمد جعفر کی اولاد

میر جعفر کی اولاد میں صرف ایک دختر کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں جو میر جعفر ماژندرانی سے بیاہی گئی تھیں۔ ان کے ایک فرزند سید حسن تھے جنھوں نے ۶ر جمادی الاول ۱۰۶۰ھ سے قبل انتقال کیا تھا۔ اور اپنے ورثا میں ایک زوجہ سکینہ بانو (بنت میر مقصود علی ولد میر ہاشم) اور ایک سے زیادہ فرزند چھوڑے تھے جو میں سب سے بڑے سید جعفر تھے۔ ان لوگوں نے ۶ر جمادی الاول ۱۰۶۰ھ کو سید حسن نبسہ میر محمد جعفر کے ورثہ کی تقسیم کے سلسلہ میں ایک صلحنامہ لکھا تھا جو مولوی عباس علی صاحب (حال سجادہ میر محمد مومن) کے یہاں موجود ہے اور جس سے پتہ چلتا ہے کہ سید حسن کی زوجہ سکینہ بانو بنت میر مقصود علی ایک ہزار تین سو روپیہ شاہجہانی حاصل کر کے سید حسن کے متروکہ سے دست بردار ہو گئی تھیں۔

اس کاغذ کی پیشانی پر مفتی احمد بن محمد کی مہر ۱۰۶۰ھ کی اور حاشیہ پر حسب ذیل تین مہریں ثبت ہیں[1]:

محمد انور (۱۰۵۰ھ) محمد فاضل رضوی (۱۰۴۱ھ) ہوالافضل (۱۰۶۵ھ)

سید جعفر ولد سید حسن کے بعد غالباً میر مجدالدین محمد کے بڑے فرزند میر محمد جعفر کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو گیا اس لئے اب تک میر صاحب کی جس اولاد کا تذکرہ لکھا گیا ہے اس کا شجرہ ہم یہاں

---

[1] یہ کاغذ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے "اقرار صحیح و معتبر شرعی نمود عصمت پناہ مسماۃ سکینہ بنت میر مقصود علی ولد میر ہاشم زوجہ سید حسن متوفی بن میر جعفر ماژندرانی درحالت صحت نفس و ثبات عقل بدیں وجہ کہ ابراکرد و گذشت از ہر دعوئے و خصومتے و بحثے کہ داشت بر ورثہ سید حسن متوفی مذکور خصوصاً از دعوی حصہ ارث خود۔" وغیرہ

نقل کر دیتے ہیں۔

میر محمد مومن

میر مجد الدین محمد

دختر (زوجہ مرزا حمزہ استر آبادی) — میر محمد جعفر — میر محمد شفیع — میر محمد مقیم

میر محمد جعفر

دختر (زوجہ میر جعفر مازندرانی)

سید حسن

سید جعفر

میر محمد شفیع اور ان کی اولاد

میر صاحب کے دوسرے نبیرے میر محمد شفیع تھے۔ جن کی اولاد اب تک موجود ہے۔ چنانچہ حال سجادہ نشین حضرت میر مومن ان ہی کی نسل میں ہیں۔ ایک محضر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زوجہ زہرا بیگم میر محمد رضائے معمائی کی دختر تھیں[1]۔ جن کے

---

[1] یہ محضر سنہ ۱۱۸۵ھ میں لکھا گیا تھا جس پر حسب ذیل اصحاب کی مہریں ثبت ہیں:—

(۱) محمد عاقل یار خاں فدوی آصف الدولہ سنہ ۱۱۶۷ھ۔ (۲) محمد عزیز سنہ ۱۱۴۴ھ۔ (۳) تجلی علی سنہ ۱۱۸۰ھ۔ (۴) بدیع الزماں خاں سنہ ۱۱۸۰ھ (۵) محمد ذاکر ولد مرزا سعید قلی بیگ سنہ ۱۱۲۹ھ

بطن سے اِن کے ایک فرزند سید محمد اور تین دختراں (یعنے فخر النساء، خیر النساء، اور شاہ بیگم) ان کے بعد بھی زندہ رہیں۔

محمد شفیع نے ابو الحسن قطب شاہ کے عہد میں اُس وقت انتقال کیا جب کہ مادنا دیوان کا دَور دَورہ تھا چنانچہ ان کے انتقال کے بعد میر صاحب کی جو جاگیرات ان کی اولاد کے قبضہ میں چلی آرہی تھیں وہ سب ضبط کر لی گئیں۔ اور اُس وقت خاندان میں کوئی ایسا بڑا آدمی باقی نہ رہا تھا جو پیروی اور کوشش کر کے یہ جاگیرات حاصل کرتا چنانچہ ۵ رمضان سنہ ۱۰۹۶ھ کو میر محمد شفیع کے ورثاء سید محمد (فرزند) شاہ بیگم، فخر النسا بیگم اور خیر النسا بیگم (دختران) اور زہرا شاہ (زوجہ) نے ایک محضر قلمبند کیا تھا جس میں لکھا ہے کہ :-

"بعد از پدرم ماہائے مقررین طفلان و یتیمان و بیوہائے بےکس و بے وسیلہ دیدہ مادھو زناردار از راہ تعدی ظلم صریح نمودہ ہمہ دیہات انعام را متعلق بت خانۂ خود کردہ و مساجد آں جد بزرگوار مطلق بے چراغ نمودہ"۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ (۶) رحمان قلی بیگ ۱۰۸۳ھ۔ (۷) قائم روشن شاہ متولی پنجہ مبارک ۱۰۸۱ھ

(۸) سید امین خاں بہادر (۹) شاہ قطب الدین محمد ولد سید مخدوم۔

ان مہروں میں شاہ تجلی علی مشہور خطاط و مصور اور مولف تزک آصفیہ کی مہر خاصکر قابل توجہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ تجلی کے اس خاندان سے اچھے مراسم تھے چنانچہ حال سجادہ نشین صاحب میر مومن کے یہاں شاہ تجلی علی کا لکھا ہوا ایک قطعہ بھی نظر سے گذرا جس کا عکس ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

یہ ایک طویل محضر ہے اور اس میں سید محمد ولد میر محمد شفیع نے میر صاحب کی جملہ جاگیرات اور جائداد کی تفصیل پیش کی ہے اور لوگوں سے شہادت طلب کی ہے کہ اس محضر میں جو واقعات درج ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں۔ چنانچہ اس محضر کے حاشیہ پر متعدد شہادتیں اور مہریں سنہ ۱۰۹۷ھ اور سنہ ۱۰۹۹ھ کی ثبت ہیں جن میں سے چند یہ ہیں :—

(۱) سید احمد ابن سید رحمت اللہ سنہ ۱۰۹۹ھ۔ (۲) بندۂ درگاہ یوسف بن ایتون سنہ ۱۰۹۷ھ۔
(۳) رفیع الدین منشی عالمگیر شاہ (۴) صدر الدین سید محمد محمود سنہ ۱۱۰۱ھ (۵) علی بیگ ولد حسین بیگ (۶) عبد اللطیف بن محمود سنہ ۱۱۱۲ھ (۷) ہدایت اللہ ولد نعمت اللہ سنہ ۱۱۱۷ھ
(۸) خان زماں بندۂ عالمگیر بادشاہ سنہ ۱۰۷۳ھ۔ وغیرہ

میر سید محمد

اس محضر کے علاوہ سید محمد بن میر محمد شفیع کا لکھا ہوا ایک اور محضر بھی مولوی عباس علی صاحب کے یہاں موجود ہے۔ یہ ۷؍ شعبان سنہ ۱۱۴۰ھ کو لکھا گیا تھا جس میں سید محمد نے اس بات کی شہادت طلب کی ہے کہ وہ میر محمد مومن کے نبیرہ زادہ اور یولچی بیگ کے نواسہ زادہ ہیں۔ اس محضر پر حسب ذیل اصحاب کی شہادتیں درج ہیں :—

حاجی منصور فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ غازی سنہ ۱۱۲۵ھ۔ محمد کاظم فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ سنہ ۱۱۲۵ھ۔ مرزا مہدی خاں صفوی سنہ ۱۱۳۱ھ۔

غرض سید محمد نے اپنے اجداد کی جاگیروں کے حصول کی بے حد کوشش کی لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کو اس میں کامیابی ہوئی تھی یا نہیں۔ البتہ اتنا یقینی ہے کہ انھوں نے بڑی

عمر میں ۱۱۸۵ھ سے قبل انتقال کیا۔ کیونکہ اس سال ان کے فرزند میر محمد حسین نے ایک محضر لکھا تھا جس میں اس امر کی شہادت طلب کی تھی کہ میر محمد رضائے معمائی کی دختر زہرا بیگم ان کی دادی یعنے میر سید محمد کی والدہ تھیں اور اس محضر پر شاہ تجلی علی کی مہر بھی ثبت ہے جس کا ذکر ابھی گذر چکا ہے۔

میر محمد حسین اور میر کاظم علی

میر سید محمد کے دو فرزندوں میر محمد حسین اور میر کاظم علی کا ذکر ایک اقرار نامہ میں ملتا ہے جو یکم جمادی الاول ۱۱۸۷ھ کو لکھا گیا تھا۔ اس میں سید حسین ولد سید جلال داماد سید محمد بن سید لار محمد بن شاہ محمد بن ملا تمیمی نے اس امر کا وعدہ کیا ہے کہ میر محمد حسین و میر کاظم علی ابنان میر سید محمد مرحوم اور مسماۃ خدیجہ بیگم ورثہ میر محمد مومن کو سال بسال عرس کے اخراجات دیا کروں گا۔ اس محضر کا تذکرہ اس کتاب کے صفحات ۸۲ و ۸۳ پر درج ہے۔

میر علی

میر محمد حسین کے ایک فرزند میر علی اور ایک دختر مخدوم بی بی تھیں۔ اور خود میر علی صاحب کے تین فرزند میر فتح علی، میر فضل علی اور میر جعفر علی اور تین دختراں تھیں۔ میر جعفر علی ایک ماں کی بطن سے اور ان کے دوسرے بھائی اور بہنیں دوسری ماں کے بطن سے تھے۔ اور ان سب کا تذکرہ اور ورثہ کی تقسیم وغیرہ ایک اقرار نامہ میں درج ہے جو ۱۲۱۱ھ میں لکھا گیا تھا اور اس وقت مولوی عباس علی صاحب کے یہاں محفوظ ہے۔

میر فتح علی

میر علی صاحب کے فرزند کلاں اور جانشین تھے۔ میرن صاحب عرف تھا۔ ان کی بھی دو بیویاں تھیں۔ ایک کے بطن سے میر عباس علی اور دوسری سے زین العابدین عرف میر بادشاہ اور دو بہنیں زندہ رہیں۔

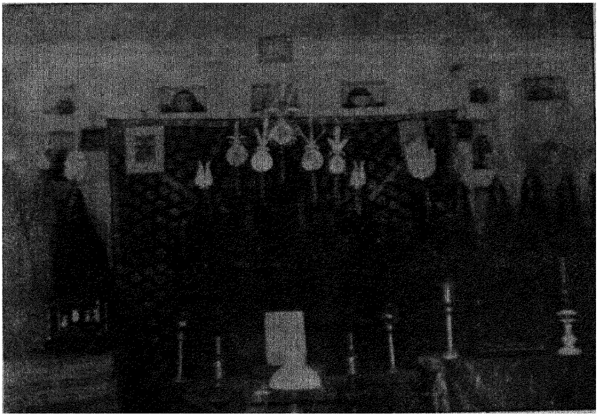
میر عباس علی میر عباس علی میر فتح علی کے جانشین ہوئے ان کی والدہ مرزا ابر علی بیگ ولد مرزا بشیر بیگ ولد مرزا ابر علی بیگ کی دختر تھیں انھوں نے ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا ان کے انتقال کے وقت ان کے اکلوتے فرزند میر حیدر علی کی عمر صرف دو سال کی تھی۔

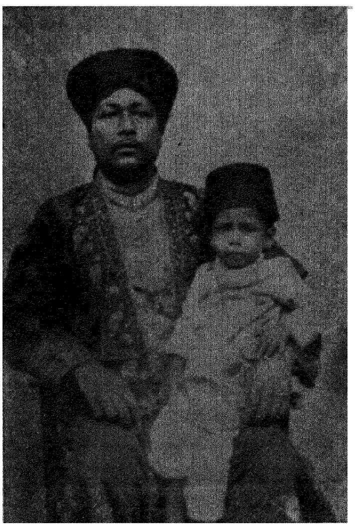
میر حیدر علی یہ حال سجادہ نشین مولوی میر عباس علی صاحب کے والد تھے۔ مولوی عبدالجبار خاں نے محبوب الزمن میں جو لکھا ہے کہ حیدر علی کو خانخاناں کے یہاں سے کوئی منصب مقرر تھی اس کی نسبت میر عباس علی صاحب کا بیان ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ خانخاناں نے ان کو شرافت نسبی کی بنا پر اپنے فرزند شجاع الملک کا مصاحب بنایا تھا۔ ان کو صرف خاص مبارک سے فرمان کوٹ اور وردمان کوٹ جاگیرات کے صلہ میں ۴۴ روپے ماہوار ملا کرتے تھے جو اب ان کے فرزند عباس علی صاحب کو بھی ملتے ہیں۔

فرمان کوٹ اور وردمان کوٹ دونوں جاگیریں میر مومن صاحب کے عود و گل کے اخراجات کے لئے آصفجاہی دور میں ان کی اولاد کے نام جاری ہوئی تھیں۔ اعتصام الملک کے عمل میں ان جاگیرات سے گیارہ سو تیس ۱۱۳۰ روپیے سالیانہ میر محمد شفیع کی اولاد کو ملتا تھا۔ بعد کو یہ جاگیریں داخل خالصہ کر کے ماہانہ منصب مقرر کر دی گئی جو اب تک جاری ہے۔

اس منصب کے علاوہ میر مومن صاحب کا جو عاشورخانہ مولوی عباس علی صاحب کے مکان پر ہر محرم میں استادہ ہوتا ہے اس کا معمول بھی صرفخاص سے پچاس روپیہ سالانہ جاری ہے۔ عاشورخانہ کے علم قدیم ہیں جن کی تصویر اس کتاب میں شامل ہے۔

میر عباس علی میر حیدر علی مرحوم کے اکلوتے فرزند ہیں جو خوش رو جوان صالح ہیں۔ اور جن کو





اوپر۔

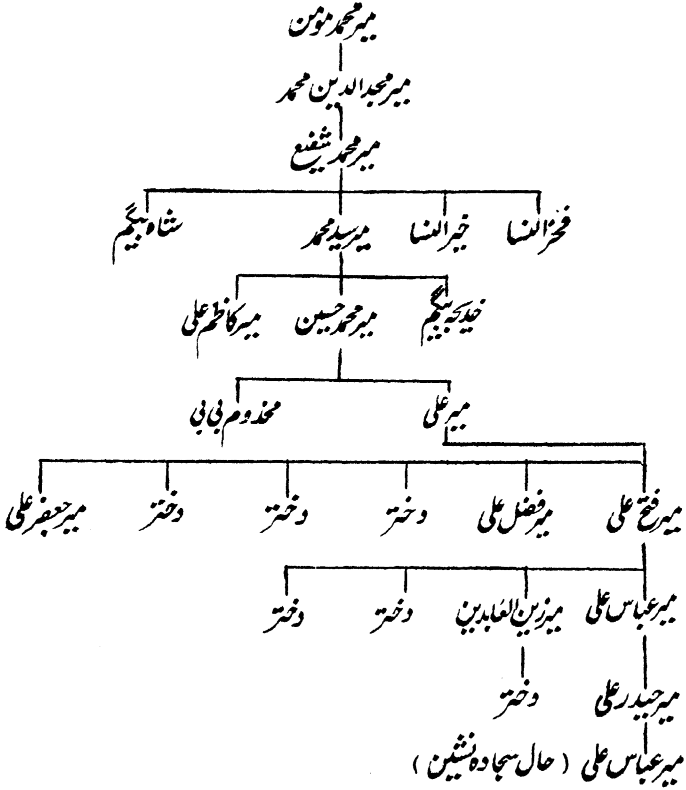
عاشور خانہ میر محمد مومن
کے علم جو ان کے نبیرہ
میر عباس علی صاحب
کے یہاں اب بھی استاد
ہوتے ہیں۔

نیچے۔

مولوی میر عباس علی صاحب
(نبیرہ میر محمد مومن)
[illegible] کے فرزند۔

تاریخ اور علم و فضل کا بھی اچھا ذوق حاصل ہے۔ چنانچہ اپنے جد امجد کی اس حیات کی ترتیب میں مولف کی بڑی مدد کی اور اپنے یہاں کے جملہ تاریخی کاغذات سے استفادہ کا موقع دیا۔ ان کے یہاں میر صاحب کا مستعملہ ایک قرآن مجید اور صندل کا چنور محفوظ ہے اور یہ دونوں چیزیں قابل زیارت ہیں۔

میر مجد الدین کے دوسرے فرزند میر محمد شفیع کی اولاد کا شجرۂ نسب یہ ہے۔



میر محمد مقیم اور انکی اولاد

یہ میر صاحبؒ کے غالباً سب سے چھوٹے بیرے تھے اور ان کا ذکر میر محمد حسین ولد میر سید محمد بن میر محمد شفیع کے اس محضر میں درج ہے جو ۱۱۸۵ھ میں لکھا گیا تھا[1]۔ اس میں لکھا ہے کہ

"خلف الصدق میر صاحب (میر مومن) مغفور مغفور میر مجدی محمد (میر مجد الدین محمد) قدس سرہ و فرزند ایشاں میر محمد مقیم و خلف صدق ایشاں میر محمد رضائے معمائی علیہ الرحمہ از بطن میر محمد رضائے معمائی مسطور دو دختر۔ یکے فاطمہ بیگم لاولد و دوم زہرہ بیگم" وغیرہ۔

اس محضر میں میر محمد رضا خلف میر محمد مقیم کے کسی فرزند کا ذکر نہیں ہے لیکن اس کتاب کی اثنائے تالیف میں ایک صاحب سید پادشاہ ساکن محلہ سلطان شاہی مولف سے ملے اور انھوں نے اپنے خاندانی کاغذات دکھائے ان سے پتہ چلتا ہے کہ میر محمد رضا کو ایک فرزند بھی تھے جن کا نام تھا میر محمد علی۔ چنانچہ سید بادشاہ خود کو انہی کی اولاد کہتے ہیں اور ان کے کاغذات کے مطابق میر محمد مقیم کی اولاد کا سلسلہ اس طرح ملتا ہے۔

میر محمد علی کے فرزند میر زین العابدین اور ان کے فرزند میر شمس الدین علی خاں میر شمس الدین علی خاں کی زوجہ مجید النسا بیگم تھیں جن کا سلسلہ نسب یہ تھا مجید النسا بنت میر ابراہیم ابن میر مومن ابن میر علی اکبر ابن میر ہاشم ابن میر سلیمان ابن میر حاجی محمد شاہ ابن سید اسحاق واصل حق

---

[1] اس محضر کی تفصیل کے لئے اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۶ و ۲۵۷ ملاحظہ ہو۔

ابن میر اسمٰعیل ابن میر نجم الدین ابن میر شمس الدین ابن سید جعفر ابن میر عبدالواحد ابن میر اسحٰق ابن سید محمد علی ابن سید شمس یحییٰ ابن سید سلطان ابن میر علی شمشیر برہنہ ابن میر احمد سرّی ابن میر علی سرّی ابن سید واجدین ابن امام موسیٰ کاظم۔

میر مومن علیخاں میر شمس الدین علی اور مجید النساء بیگم سے ایک فرزند میر مومن علی خاں یادگار تھے جن کی دو بیویاں تھیں۔ ایک اولیا بیگم بنت میر محمد باقر ابن میر ببر علی اور دوسری عالی بیگم بنت میر محمد شریف ابن میر ابوطالب ابن میر محمد شفیع۔ زوجہ اول الذکر سے ایک فرزند میر حسین علی اور زوجۂ ثانی الذکر سے دو فرزند میر خیرات علی اور میر حیدر علی زندہ رہے۔ ان تینوں فرزندوں میں سے صرف میر خیرات علی کی اولاد کا پتہ چلتا ہے۔

میر خیرات علی میر خیرات علی کی بھی دو بیویاں تھیں۔ ایک جمال النسا اور دوسری سکندر بیگم بنت دردانہ بیگم بنت میر مراد علی خاں ابن میر ذوالفقار علی خاں ابن سید فتح علی خاں ابن اقتدار جنگ ابن میر موسوی خاں۔ زوجہ اول الذکر سے چار فرزند میر محمود علی، میر محسن علی، میر بہبود علی میر قنبر علی اور دو دختراں تھیں۔ اور دوسری زوجہ سے بھی تین فرزند محب علی عرف مصطفےٰ علی میر عباس علی اور میر برکت علی اور ایک دختر تھیں۔

میر برکت علی نجیب برکت علی نجیب ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کا قلمی دیوان موجود ہے۔ وہ غزلوں کا ایک ماہوار گلدستہ ''نازونیاز'' عرصہ تک شائع کرتے رہے۔ نازونیاز کے ایک گلدستہ کے لئے حضرت غفران مکاں آصفجاہ سادس نے اپنی ایک غزل فصیح الملک مرزا داغ کے توسط سے روانہ کی تھی۔ چنانچہ مرزا داغ نے ان کے نام جو خط لکھا تھا وہ سید بادشاہ صاحب

خلف برکت علی نجیب کے یہاں موجود ہے اور چونکہ یہ مرزا داغ کا ایک غیر مطبوعہ خط ہے اس لئے اسکی نقل درج ذیل ہے :۔

مورخہ ستم جمادی الآخر ۱۳۱۵ھ　　　　اعلیحضرت بندگان متعالمدظلہ العالی دام اقبالہ

سہ شنبہ وقت ۱۲ بجے

جناب میر صاحب کرم گستر مخلصان بلاغت نشان میر برکت علی صاحب نجیب سلمہ اللہ تعالےٰ

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ　　　　نے اپنی غزل درج گلدستہ کرنے کیلئے

آپ کو مرحمت فرمائی۔ (تاکہ) اس سے گلدستہ (کو) فخر و عزت و وقعت حاصل ہووے۔

یہ طرح آپ کے گلدستہ کی ہے۔ جو پہلی طرح ہوی ہے اس کو بطور مناسب سپاسنامہ کے ساتھ آئندہ گلدستہ میں چھاپ کر مشتاقوں کو بہرہ مند فرمائیے۔ منرصد کہ غزل شاہی کی رسید مسمی محمد حسین ملازم حامل تحریر ہذا کے ہاتھ عنایت فرمائیے کہ سرکار میں پیش ہوگی۔ زیادہ شوق است وبس۔

راقم ہیچمداں

فصیح الملک داغ دہلوی

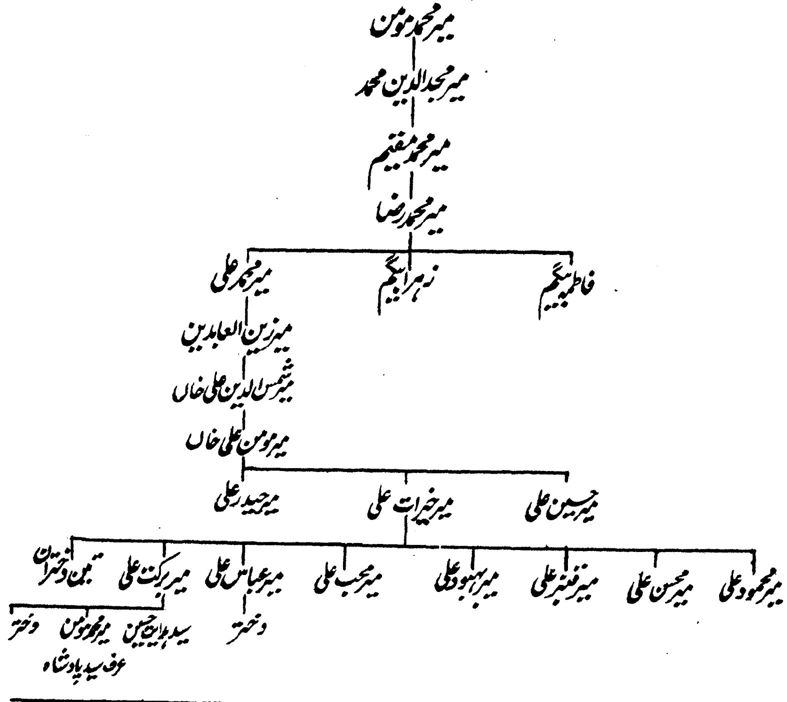
محبوب گنج

میر محمد مومن عرف سید بادشاہ

برکت علی نجیب کے دو فرزند سید ہدایت حسین اور میر محمد مومن اور ایک دختر تھیں۔ میر محمد مومن اپنے عرف سید پادشاہ سے مشہور رہیں۔ محلہ سلطان شاہی میں مقیم ہیں۔ معمر آدمی ہیں ان کو فرزند نرینہ نہیں ہے۔ ان کے یہاں ایک تاریخی پھریرا ہے جس کا ذکر اس کتاب کے

صفحہ ۲۴۶ پر درج ہے ۔ ان کے یہاں جو خاندانی شجرہ ہے اس میں حضرت میر محمد مومن پیشوا کے آباواجداد کے نام بھی درج ہیں لیکن خود میر صاحب کے والد کا نام غلط لکھا ہوا ہے۱ ۔

میر محمد مقیم کی اولاد کا بیان ختم کرنے کے بعد انکا شجرہ درج کیا جاتا ہے ۔



۱ اس شجرہ میں میر صاحب کا سلسلہ نسب یوں لکھا ہے :- میر محمد مومن پیشوا ابن سید سلیمان ابن سید یعقوب ابن سید محبوب ابن سید سبحان ابن سید رحمان ابن سید سلطان ابن سید احمد ابن سید نور خدا ابن سید شمس ابن سید اسحاق ابن سید مجید اللہ ابن علی موسیٰ رضا ۔

میر صاحب کے دیگر اقربا

میر مومن صاحب کی اولاد سے متعلق جو کاغذات ان کے موجودہ سجّادہ نشین مولوی میر عباس علی صاحب کے یہاں موجود ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے ایک بھائی میر شاہ علی تھے جو میر صاحب کی اولاد کی طرح محلہ میر مومن میں دارالشفائے شاہی کی عمارت کے عقب میں رہا کرتے تھے۔ اور وہیں اس وقت ان کا مزار بھی واقع ہے جو ایک چار دیواری میں محصور ہے۔

میر شاہ علی برادر میر محمّد مومن

میر شاہ علی بھی اپنے بھائی کی طرح ایک اہل اللہ بزرگ تھے اور ان کے کشف و کرامات کے قصے اب تک مشہور رہیں۔ ممکن ہے کہ ان کی اسی بزرگی کے خیال سے ان کو دائرہ میر صاحب کی بجائے انہی کے مکان یا جائے وفات میں دفن کر دیا گیا انھوں نے ۱۰۹۱ھ کے قبل ہی انتقال کیا تھا۔ ان کی اولاد سے متعلقہ کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان کی اولاد نرینہ غالباً اب باقی نہیں ہے کیونکہ ان کے فرزند میر قربان علی اور نبیرے میر عبداللہ نے ۱۱۴۴ھ سے قبل انتقال کیا تھا۔ میر عبداللہ کے فرزند میر سید حسین تھے جن کے ایک محضر مورخہ ۱۱۴۴ھ کا ذکر اس کتاب کے صفحہ ۳۵ پر گذر چکا ہے۔

میر مومن صاحب اور شاہ علی صاحب کی اولاد کے آپس میں اتنی یگانگت تھی اور شادی بیاہ کے ایسے رشتے ہوئے کہ آخر کو دونوں کی اولاد ایک دوسرے میں ضم ہو گئی چنانچہ اب میر عباس علی صاحب ہی میر شاہ علی صاحب کی درگاہ کے سجادہ اور وارث ہیں۔

نواں حصّہ

دائرہ

حضرت میر مومن کے دائرے کا ذکر اس کتاب میں بارہا آچکا ہے[1]۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آج ان کا نام محض ان کے اسی دائرہ کی وجہ سے زندہ اور مشہور خواص وانام ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا جب کہ سب جانتے ہیں کہ میر صاحب کا طبعی رجحانِ فیض رسانی اور خدمت خلق کا جذبہ اس کی تیاری وتعمیر کا باعث ہے۔ عبد الجبار خاں نے محبوب الزمن میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ :-

مقصد

"میر موصوف ہمدرد قوم تھا۔ اُس زمانہ میں دیار و امصار سے اکثر اہل کمال اس ملک میں وارد ہوتے تھے۔ شہر میں مسافر خانوں وغیرہ مقامات میں جہاں موقع پاتے تھے فروکش ہو جاتے تھے۔ بمصداق اذا جاء اجلہم لایستاخرون۔ ابھی کامیاب نہ ہوتے تھے کہ مسافر عدم ہوتے۔ ان بے چارے غربا کی تجہیز و تکفین پوری طور سے نہیں ہوتی تھی اور دفن و غسل کا برابر بندوبست نہیں ہوتا تھا۔"

غرض ایسے مسافروں اور غریبوں کی آخری منزل کے انتظام کا خیال میر صاحب جیسے نیک اور مخیر کے دل میں پیدا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ انھوں نے شہر حیدرآباد کی تعمیر کے ساتھ ہی ایک دائرے کی تعمیر کا بھی ارادہ کر لیا۔ یوں بھی وہ جانتے تھے کہ ایک معیاری اور باضابطہ شہر کے لئے ضروری ہے کہ ایک اچھا اور باموقع قبرستان بھی ہو۔ اس لئے انھوں نے شہر کی تکمیل کی خاطر یہ کام

---

[1] دیکھو صفحات ۵۰ - ۵۱ - ۲۳۰ - وغیرہ

خود انجام دیا۔

محل وقوع معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی تعمیر کے وقت جب میر صاحب نے دائرہ کے لئے زمین کا انتخاب کرنا چاہا تو پہلے شہر کی جانب مشرق وہ مقام پسند کیا جو اب دروازہ یاقوت پورہ کا بیرونی حصہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے وہاں کی زمین خرید بھی لی تھی۔

گلزار آصفیہ میں لکھا ہے:۔

"بیرون دروازہ یاقوت پورہ زمینے خریدہ وقف ساختند۔ بعد ازاں ایں زمیں دائرہ اندرون بلدہ کہ خود ہم درآنجا مدفون اند بخوش خریدی گرفتہ۔"

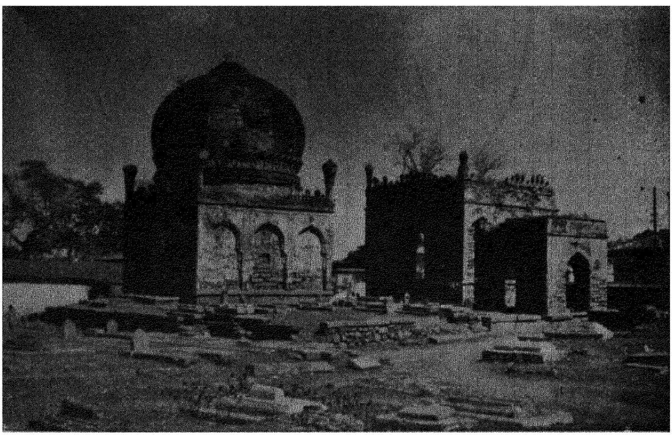
صفحہ ۶۱۱۔

موجودہ جگہ کا انتخاب ہر حیثیت سے موزوں تھا۔ اس کو صحیح معنوں میں نقاش کا نقش ثانی سمجھنا چاہئے جو بالعموم نقش اول سے بہتر ہوتا ہے۔ بعد کے زمانوں میں حیدرآباد کی آبادی کا رُخ بدل جانے اور محمد قلی قطب شاہ کی بنائی ہوی اصلی ترتیب کے باقی نہ رہنے کے باعث یہ دائرہ آبادی میں محصور ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اس کے محل وقوع کی خوبی متاثر ہوی۔ اور میر مومن صاحب نے جن خصوصیتوں کی بنا پر اس کو منتخب کیا تھا ان کی اہمیت باقی نہ رہی۔

مقام کی موزونیت غرض تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ میر صاحب کی نظر انتخاب کتنی اچھی تھی۔ انھوں نے دائرہ کے موجودہ مقام کو چند وجوہ کی بنا پر پسند کیا تھا۔ مثلاً

سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ پہلے ہی سے دو بزرگوں یعنے حضرت شاہ چراغ





دائرہ میر محمد مومن کے دو منظر

اورحضرت نورالہدیٰ کی درگاہیں زیارت گاہ خواص وعوام تھیں۔ (ان دونوں کا ذکر آئندہ صفحات میں تفصیل سے کیا جائے گا)۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ مقام اس مشہور شاہراہ پر واقع تھا جو دارالسلطنت سے مچھلی بندر سیکاکول اور قطب شاہی سلطنت کے سب سے بڑے یعنے مشرقی وجنوبی صوبوں کو جاتی تھی۔ اور اس لئے گذرگاہ عام پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ مقام ہمیشہ آباد اور با رونق رہتا تھا اور گولکنڈہ سے نکلتے ہوئے یا گولکنڈہ کو جاتے ہوئے قافلوں اور لشکروں کی پہلی یا آخری منزل کا کام دیتا تھا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ محمد قلی قطب شاہ نے قلعہ گولکنڈہ کی فصیل سے جانب مشرق دور دور تک جو میدان اور زمینیں ایک عظیم الشان شہر کی تعمیر کے لئے منتخب کی تھیں یہ جگہ ان سب کے آخر میں جانب جنوب واقع تھی۔ اس طرح پوری آبادی سے علٰحدہ ہونے کے باوجود شہر سے قریب تر تھی۔

چوتھی وجہ یہ کہ حیدرآباد کے محلوں اور بازاروں کی اصلی ترتیب کے لحاظ سے یہ دائرہ ان محلوں سے متصل تھا جو ایرانی امراء اور شہر کے عمائدین کے قیام کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

پانچویں مصلحت یہ تھی کہ ہمعصر سلطنتوں (احمدنگر، بیجاپور، بیدر، اور دہلی) کے سفیر اور امیر جن راستوں سے شہر حیدرآباد میں داخل ہوتے تھے ان کی آخری حد پر یہ مقام واقع تھا۔ یعنی اس طرف سے آنے والے قبرستان پر سے گذرنے کی جگہ پہلے بادشاہی عاشورخانے محلات شاہی، جلوخانہ پادشاہی (موجودہ چارکمان)، جامع مسجد اور چارمینار تک پہنچتے تھے۔

جس کی وجہ سے شہر کی رونق، زندگی اور شان وشکوہ کا بڑا اچھا اثر پڑتا تھا۔ یہی اثر تھا کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب غازی پہلی دفعہ شہر حیدرآباد میں داخل ہوئے تو اُن کی زبان سے بے تحاشا نکل پڑا کہ

"ایں بلند بلند چیست ؟"

جس کے جواب میں اُن کے ندیم خاص نعمت خان عالی نے عرض کیا کہ :۔

"بلند ہمت بودند عمارتہائے بلند ساختند۔"

غرض جب کئی امور کے لحاظ سے یہ مقام میر صاحب کو پسند آگیا تو انھوں نے اطراف واکناف کی زمینیں اپنی ذاتی رقم سے خریدیں اور بقول عبدالجبار خاں :۔

"اُس زمین میں جو کچھ جھاڑی تھی اس کو کٹوایا۔ صاف وہموار میدان بنایا۔ اور کئی لاکھ ہون خرچ کر کے کربلائے معلیٰ کی خاک پاک کو چند جہاز میں بھروا کر منگوایا اور اس میدانِ ہموار کو تا بقدِ آدم کھدوایا اور مٹی کو نکلوایا۔ اس مٹی خارج شدہ کی جگہ کربلائے معلیٰ کی خاک پاک کو ڈلوا کر اس میدان محفوظ کو معمور کردیا۔"[1]

کربلائے معلیٰ کی خاک

یہ امر ایک حد تک یقینی ہے کہ میر صاحب نے کربلائے معلیٰ سے خاک پاک منگوائی تھی چنانچہ عبدالجبار خاں کے علاوہ غلام حسین خاں نے بھی

---

[1] محبوب الزمن صفحہ ۹۹۲ ۔

گلزار آصفی میں لکھا ہے کہ :۔

"خاک پاک کربلائے معلی طلبیدہ پاشیدہ"[1]

گلزار آصفی سے پہلے ماہنامہ میں بھی اس واقعہ کو ان الفاظ میں قلمبند کیا گیا تھا:۔

"ہفتاد بار شتراں از خاک کربلائے معلے بر جہازہا طلبیدہ در دائرہ گستر انید"[2]

اگرچہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میر صاحب نے خاک کربلا اپنے موکل جناتوں کے ذریعہ سے منگوائی تھی لیکن ماہنامہ کی روایت صحیح ہوگی کیونکہ میر محمد مومن جیسے صاحب دولت و با اقتدار وزیر مطلق اور پیشوا کے لئے یہ امر مشکل نہ تھا کہ وہ بذریعہ جہاز ستر اونٹوں کے بار کی خاکِ پاک کربلا سے منگوا لیتے۔

دیگر ضروریات دائرہ کے لئے زمین کی خریدی، ہمواری، اور خاک پاک کی فراہمی کے علاوہ میر صاحب کو اور چند امور کا بھی اہتمام کرنا پڑا جن میں سرائے، مسجد، باوٗلی، اور حوض کی تعمیر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دائرہ کی شمالی سمت میں جہاں اب داخلہ کا بڑا دروازہ ہے اور نقار خانہ ہے دونوں طرف بڑی بڑی سرائیں بنائی گئی تھیں تاکہ مومنین کے ہمراہی اور زیارتوں کے لئے آنے والے لوگ ان میں ٹہر سکیں اور اطمینان کے ساتھ مراسم ادا ہوں۔ لیکن اب ان سراؤں کے نشان بھی باقی نہیں ہیں۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۶۱۱ — [2] ماہ نامہ ورق ۳۰۶ الف۔

وقفنامہ بہر حال جملہ انتظامات کی تکمیل کے بعد میر صاحب نے اس پورے دائرہ اور اسکے ملحقات کو ایک وصیت نامہ کے ذریعہ سے وقف کر دیا۔ میر صاحب کا یہ وصیت نامہ رفاہ عامہ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن افسوس ہے کہ تلاش کے باوجود اب تک کہیں نظر سے نہ گذرا۔ البتہ گلزار آصفی اور محبوب الزمن اور دیگر تاریخوں میں اس وقف کا تذکرہ درج ہے۔ چنانچہ لکھا ہے :۔

"تمام دائرہ وقف کردہ میر مومن صاحب قبلہ است خرید و فروخت ندارد"[1]

غسالوں کی تعلیم و تربیت دائرے اور اس سے ملحقہ عمارتوں کو وقف کرنے کے علاوہ غسالوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں میر صاحب نے جو کام کیا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ لکھا ہے کہ :۔

سو غلام و کنیزک خرید کے ان کو بھی ضروری مسائل کی تعلیم دیکر آزاد کر دیا۔ اور ان کو سرکار کی طرف سے معاش و انعام مقرر کر دیا۔ غلام و کنیزک میں آدھے شیعہ اور آدھے سنی تھے۔ اب بھی بدستور غسالوں میں آدھے سنی اور آدھے شیعہ ہیں۔ گویا ہمارے قول کی تصدیق کا محضر ہے۔ اور یہ خدمت ان کے تفویض تھی کہ جہاں میت ہو وہ میت کا غسل اور کفن اپنے ہاتھوں سے کریں اور کسی سے کچھ سوال نہ کریں۔ اس وقت سے حیدر آباد دکن میں غسالی قائم ہوی۔ انہی کی اولاد بڑھتے بڑھتے

---

[1] گلزار آصفی صفحہ ۶۱۱ ۔

غسالوں کی ایک قوم ہوگئی۔" محبوب الزمن صفحہ ۹۹۳۔

صاحب محبوب الزمن کے اس بیان کی تصدیق تاریخ ماہنامہ سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ :۔

غلامانِ خود را مسائل غسل مذہب فریقین تعلیم دہانیدہ چاہ وحوض غسل اموات تیار ساختہ غسالاں را بامر تجہیز و تکفین در دائرہ متقین و مامور نمود۔ چنانچہ تاحال اولاد آنہا بر کار مامورہ مستعد اند[1]"

اسی طرح تاریخ گلزار آصفی میں بھی غسالوں کی نسبت تفصیل سے لکھا ہے۔ اور اس میں تو یہ بھی بتایا ہے کہ میر صاحب نے اپنے سوزر خرید غلاموں کو ہر دو مذاہب کے طریقے تجہیز و تکفین سکھا کر نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ ان کے رہنے کے لئے دائرے کے قرب وجوار میں متعدد مکان اور دو کانیں بھی بنوادیں اور مدد معاش کے لئے زمینیں بھی دلوادیں تاکہ معاش سے بے نیاز رہکر خدمت انجام دیں اور کسی کے آگے دست طلب دراز نہ کریں[2]۔

لیکن بعد کو جب کچھ تو زوال سلطنت قطب شاہیہ کے باعث اور کچھ غسالوں کی اولاد کی کثرت یا غفلت کی وجہ سے میر صاحب کے مقرر کئے ہوئے ذرائع آمدنی باقی نہ رہے تو ان غسالوں نے اجرت پر کام کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ آج سے سو سال بیشتر ہی سے یہ غسال اجرت پر کام کرنے لگے تھے۔ اور ان کی بوڑھی عورتیں مردوں کے کپڑے فروخت کرتی تھیں لکھا ہے:۔

---

[1] ماہنامہ ورق ۳۰۶ ا۔ [2] گلزار آصفی صفحہ ۶۱۱۔

"زنان عجائز کہن سالہ اینہا رخت بدنی و اسباب پارچۂ اموات را شوب دہانیدہ
در چوک بلدہ می فروشند و غربا دیدہ و دانستہ برائے کفایت خرید می کنند"

گلزار آصفی صفحہ ۶۱۱ —

دائرے کے مشہور مقابر

یوں تو دائرے کی تیاری کے ساتھ ہی اس میں تدفین کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو گا لیکن راقم الحروف کو اس میں کوئی کتبہ ۱۱۰۰ھ سے قبل کا نظر نہ آیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تیاری اور کربلائے معلیٰ کی خاک پاک کی فراہمی میں کامیابی اس سنہ کے بعد ہی کے دس بارہ سالوں کے اندر حاصل ہوئی ہو گی۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۱۰۱ھ تک اس قبرستان میں متعدد میتیں دفن ہو چکی تھیں چنانچہ میر ابوتراب اور سلطان احمد بن حیدر علی کی قبروں پر اسی سنہ کے کتبے موجود ہیں۔ بعد کو یہ دائرہ اتنا مقبول ہوا کہ صرف ڈیڑھ سو سال کے اندر اس میں چھ سات لاکھ میتیں دفن کی گئیں۔ چنانچہ میر صاحب کے نبیرے سید محمد نے اپنے اس محضر (مورخہ ۵ رمضان ۱۱۶۰ھ) میں جس کا ذکر اس کتاب کے صفحہ ۲۵۷ پر گذر چکا ہے لکھا ہے کہ:—

"در مقبرۂ جدم قریب شش و ہفت لک مقابر سادات عظام و مشائخ کرام از عرب و عجم واقع است۔"

شاہ چراغ

دائرہ میں جو مشاہیر دفن ہیں ان کے ذکر سے پہلے ضروری ہے کہ حضرت شاہ چراغ کا مختصر تذکرہ لکھا جائے۔ کیونکہ شاہ چراغ صاحب کا مزار اسی جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے بھی میر صاحب نے اس مقام کو عام قبرستان بنانے کے لئے منتخب کیا تھا۔

شاہ چراغ صاحبؒ کی نسبت گلزار آصفی اور محبوب الزمن میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نجف اشرف سے حسب الحکم حضرت علی علیہ السلام وارد دکن ہوئے اور قلعہ گولکنڈہ سے چند میل کے فاصلہ پر اس جگہ قیام پذیر ہوئے جہاں اب ان کا مقبرہ واقع ہے۔ اس وقت شہر حیدرآباد کا وجود بھی نہ تھا بلکہ یہاں ایک چھوٹا سا گاؤں چیلم واقع تھا جو ویران جھاڑیوں اور جنگل کے درمیان واقع تھا۔ اور جس میں صرف چند برہمنوں کے مکان تھے شاہ صاحبؒ نے اس موضع کے قریب اس گذرگاہ کے کنارے قیام کیا جو سیکاکول اور راجمندری وغیرہ بندروں کو جاتی تھی۔ اس وقت تک ادھر مسلمانوں کا گذر نہ ہونے پایا تھا۔ برہمنوں نے شاہ صاحب کی درویشانہ متوکل زندگی اور تصرفات کو دیکھ کر کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ رفتہ رفتہ ان کے معتقد ہوتے گئے۔ آخر کار نلگنڈہ اور دیورکنڈہ کو آنے جانے والے مسلمانوں نے ایک آدہ رات یہاں منزل کرنی شروع کی۔ اور کچھ عرصہ میں شاہ صاحب کے اطراف چند مسلمان بھی جمع ہوگئے۔

جب شاہ صاحب نے وفات پائی تو پہلے ہی سے ایک معتقد کو تاکید کردی تھی کہ میری تجہیز وتکفین میں عجلت نہ کرنا کیونکہ جناب امیر المومنین علی علیہ السلام نے ایک سوداگر کو متعین کردیا ہے کہ وہ تمام ضروری اسباب کے ساتھ آئے گا اور میری تجہیز وتکفین کرے گا۔ تم لوگ بھی اس کام میں اس کے ساتھ شریک ہوجانا اور میرا سلام کہنا۔ غرض حضرت کی وصیت کے مطابق لوگوں نے انتظار کیا اور آخر کار ایک شتر سوار تجہیز وتکفین کا سامان لئے ہوئے آیا اور تجہیز وتکفین کرکے دوسرے روز علی الصباح روانہ ہوگیا لوگوں نے دریافت کیا تو وہی جواب دیا جو شاہ صاحب نے پہلے ہی سے کہدیا تھا۔

شاہ چراغ صاحب کا مزار بن جانے کے بعد سے یہ مقام مسلمانوں کی زیارت گاہ بن گیا اور آبادی بڑھنے لگی۔ شاہ صاحب کے مقبرہ کی تصویر اس کتاب میں شامل ہے۔

شاہ نورالہدیٰ

ایک عرصہ بعد جب کہ شہر حیدرآباد بھی بن چکا تھا حضرت سید نورالہدیٰ چند سیدوں اور اپنے بھائی کے ساتھ یہاں وارد ہوئے اور اس جگہ مقیم ہوگئے جہاں اب ان کا مقبرہ واقع ہے۔ ان کی آمد سے یہ مقام اور بھی آباد ہوگیا۔ انھوں نے بھی اپنی وفات سے قبل وصیت کی کہ مجھے غسل دے کر اور کفن پہنا کر منتظر رہیں یہانتک کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے بجلی کی سی سرعت سے آئے گا اور مجھے دفن کر جائیگا لیکن کوئی اس سے کچھ نہ پوچھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ایک سوار آیا اور زمین پر ہاتھ رکھکر ایک بنی بنائی قبر برآمد کی اور اس میں نورالہدیٰ صاحب کو اتار کر فاتحہ پڑھی اور روانہ ہوگیا۔ لیکن زمین پر جہاں جہاں گھوڑے کا سم پڑا نشان زائل ہوگیا صرف ایک پتھر پر نشان باقی رہا۔ جو اب تک موجود ہے اور لوگ اس کی زیارت کرتے ہیں کیونکہ وہ سوار خود حضرت علی علیہ السلام تھے

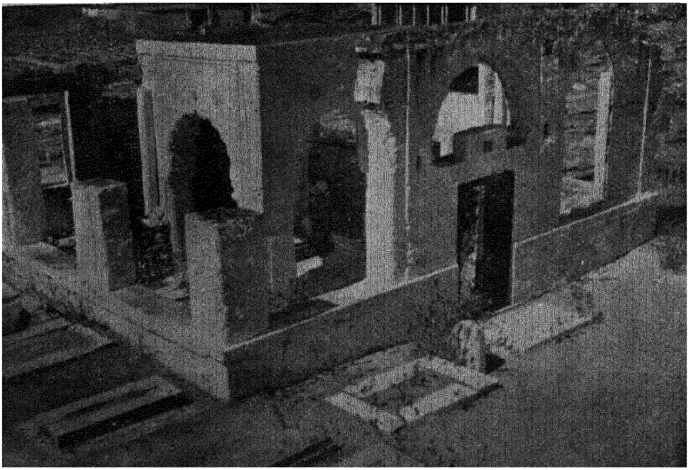
یہ واقعات گلزار آصفی اور محبوب الزمن سے بطور خلاصہ درج کئے گئے ہیں۔

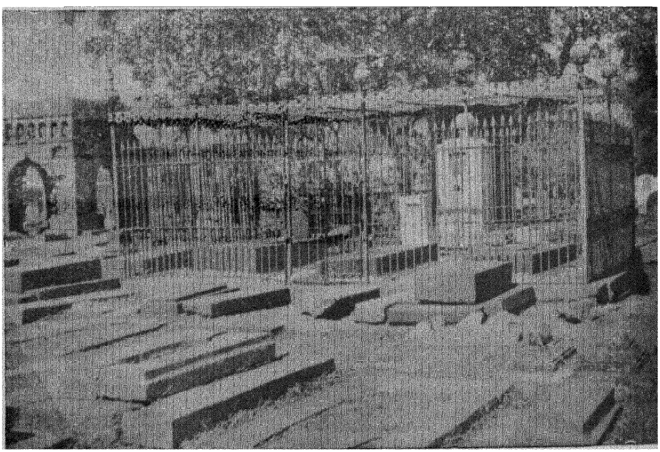
میر صاحب کی زندگی میں

یہ تو دائرہ کے بننے سے پہلے کے واقعات ہیں۔ دائرہ کی تعمیر کے بعد خود میر مومن صاحب کی زندگی ہی میں سیکڑوں لوگ اس میں دفن ہو چکے تھے۔ چنانچہ ہم پہلے ان لوگوں کا ذکر کریں گے جو عہد محمد قلی قطب شاہ میں اس دائرے میں دفن ہوئے۔

عہد محمد قلی کی قبریں

شیخ محمد صفی شیرازی سخن گو اور بذلہ سنج تھا۔ فن سیاق میں فرد فرید سمجھا جاتا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں شیراز سے حیدرآباد آیا اور





اوپر- شاہ چراغ صاحب کا مزار واقع دائرہ میر مومن صاحب

صفی شیرازی

بادشاہ کے بذل ونوال سے مستفید ہوا۔ دفتر حساب میں میر منشی کی خدمت پر فائز تھا۔ اسی عہد میں فوت ہوا اور دائرہ میر محمد مومن میں دفن کیا گیا[1]۔ اس کی قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔

دیگر اصحاب

عہد محمد قلی کی جن قبروں کے کتبے اب تک محفوظ ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں حسب ذیل اصحاب دائرہ میں مدفون ہوئے۔

میر ابوتراب	۱۰۱۲ھ	خواجہ محمد علی	۱۰۱۴ھ
سلطان احمد بن حیدر علی	۱۰۱۲ھ	ابراہیم بیگ	۱۰۱۵ھ
محمد صالح	۱۰۱۴ھ	محمد صالح	۱۰۲۰ھ

عہد سلطان محمد قطب شاہ کی قبریں

یوں تو سلطان محمد کے عہد میں سیکڑوں اصحاب اس دائرے میں مدفون ہوئے لیکن ان سب میں قابل ذکر بی بی خدیجہ بنت میر سید علی استرآبادی شیخ آوند کی قبر ہے۔ یہ ایک سنگین گنبد میں واقع ہے جو دائرے میں داخل ہوتے ہی جانب مشرق نظر آتا ہے۔

بی بی خدیجہ

چند سال قبل اس گنبد کو صاف کر کے محفوظ کر لیا گیا ہے ورنہ اس سے قبل بہت گندہ حالت میں تھا۔ بی بی خدیجہ کی قبر مصفا سنگ سیاہ کی ہے جو نہایت

---

[1] محبوب الزمن میں صفی شیرازی کی تاریخ وفات ۹۷۴ھ لکھی ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اس سنہ میں دائرہ تو کجا خود سلطان محمد قلی کی بادشاہت کا بھی وجود نہ تھا۔ بلکہ اس وقت محمد قلی کی عمر صرف چند ماہ کی تھی۔

خوشخط ادعیہ و آیات قرآنی سے مملو ہے صاحب مزار کا نام اور سنہ وفات ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"فوت عفیفہ صالحہ صائمہ ساجدہ بی بی خدیجہ بنت سید میر علی استرآبادی شیخ آوند
بتاریخ عاشر جمادی الاول ۱۰۳۱ھ"۔

اس سنگ مزار کی تصویر مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی نے اپنی کتاب مآثر دکن کے صفحہ ۳۱ پر شائع کی ہے۔

بی بی خدیجہ کے اس گنبد کے علاوہ ان کی ایک عالیشان مسجد بھی اس گنبد کے جانب مشرق واقع ہے جس کا راستہ دائرہ کے باہر اس سڑک پر موجود ہے جو گولی پورہ کے دروازہ کی طرف جاتا ہے۔

علی گل استرآبادی میر صاحب کے ہموطن سادات سے تھے۔ مدت تک ایران میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ شعر و سخن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ میر صاحب نے حیدرآباد بلا کر شاہی منصبداروں میں شامل کر دیا تھا۔ اور انہی کی زندگی میں ۱۰۳۳ھ میں فوت ہوئے اور دائرے ہی میں دفن کئے گئے[1]

کوکبی گرجی قباد بیگ کوکبی گرجی الاصل تھے۔ اگرچہ شاہ عباس صفوی کے غلام تھے لیکن علم و فضل اور شعر و سخن کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ چنانچہ جب حیدرآباد آئے تو بادشاہ نے بڑی قدر و منزلت کی اور منصب مقرر کر دیا۔ کوکبی نے ۱۰۳۳ھ میں وفات پائی اور دائرہ میں

---

[1] محبوب الزمن صفحہ ۹۶۸۔

مدفون ہوئے[1]۔

دیگر اصحاب عہد سلطان محمد قطب شاہ میں دوسرے جو اصحاب دائرے میں مدفون ہوئے ان میں خود میر صاحب کے فرزند میر مجد الدین محمد بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ دفن ہوئے ہونگے۔ لیکن جن کی قبروں پر اب تک کتبے محفوظ ہیں ان کے نام یہ ہیں:۔

محمد ربیع ۱۰۲۹ھ۔ اور ملا محمد اردبیلی ۱۰۲۵ھ

میر صاحب کے بعد یہ تو ان اصحاب کا ذکر تھا جو خود میر مومن صاحب کی زندگی میں فوت اور دائرے میں مدفون ہوئے۔ اب ہم ایسے لوگوں کا ذکر کریں گے جو میر صاحب کی وفات کے بعد اس گنج شائگاں میں شامل ہوئے۔

عہد عبداللہ قطب شاہ میں یہ عہد بہت طویل تھا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ اس زمانہ میں دائرہ معمور ہو گیا ہو۔ حدیقۃ السلاطین میں اکثر لوگوں کی وفات کے تذکرہ میں دائرہ کی تدفین کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ ان سب میں مرزا حمزہ استر آبادی کا نام اہم ہے جو میر صاحب کے پوترے داماد تھے اور ۱۰۴۸ھ میں فوت ہوئے۔ ممکن ہے کہ یہ خود میر صاحب کے مقبرے میں مدفون ہوں۔ ان کی قبر کا پتہ نہ چل سکا۔

فکری اصفہانی خواجہ محمد رضا اصفاہانی شیخ بیگ کے فرزند اور علم حساب و سیاق کے ماہر تھے۔ خوش مذاقی اور ظرافت طبع سے بھی متصف تھے۔ شاعری کی حیثیت سے بھی

---

[1] محبوب الزمن صفحہ ۹۵۰۔

شہرت حاصل کی۔ آخر میں ترک علائق کر کے اصفہان سے حیدرآباد آئے اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے۔ حکیم شفائی اور فکری اصفہانی میں معاصرانہ نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ چنانچہ دونوں کے کلام میں ایک دوسرے کی ہجو یہ نظموں کو خاص جگہ حاصل ہے۔ غالباً سنہ ۱۰۶۰ھ میں فوت اور دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے[1]۔

فطرت مشہدی میر ابو تراب مشہدی صاحب استعداد اور ذکی الطبع شاعر تھے۔ ہندوستان کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے عہد عبداللہ قطب شاہ میں وارد حیدرآباد ہوئے۔ شاہی دربار میں اعزاز منصب حاصل کیا۔ مدت تک آرام سے بسر کرنے کے بعد سنہ ۱۰۶۰ھ میں فوت اور دائرہ میں مدفون ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ لوح مزار پر یہ رباعی کندہ کرائی گئی تھی۔

فطرت تو روزگار نیرنگی کرد　　نو اغنت بمہر و خارج آہنگی کرد
آن سینہ کہ عالمے در و می گنجد　　اکنوں ز تردد نفس تنگی کرد[2]

ہماری نظر سے دائرہ میں یہ لوح مزار نہیں گزرا۔

خداویردی سلطان شاہجہاں کی ملازمت ترک کر کے بنگالہ سے حیدرآباد آئے۔ اور عبداللہ قطب شاہ کی بارگاہ میں آستاں بوسی کی التجا کی۔ بادشاہ نے بڑی قدر و منزلت کی اور بقول مولف حدیقۃ السلاطین "در سلک وزرائے ذی اعتبار منتظم فرمودند"[3]

---

[1] محبوب الزمن میں سنہ وفات سنہ ۱۰۱۰ھ لکھا ہے لیکن خود عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔

[2] محبوب الزمن جلد دوم صفحہ ۹۳۴۔　　[3] حدیقہ صفحہ ۹۳۔

مجلس وزرا میں شریک ہونے کے بعد ہی محرم ۱۰۴۱ھ میں خداویردی سلطان کو عبداللہ قطب شاہ نے یولچی بیگ کے ہمراہ مرہری پنڈت سپہ سالار عادل شاہ کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ لیکن مرہری نے قطب شاہی فوج سے خائف ہوکر اپنے بھانجہ زہری کے ذریعہ سے صلح کرلی۔ چنانچہ ۱۵ صفر ۱۰۴۱ھ کو لڑائی کا یہ خطرہ ٹل گیا۔ تاہم چند ماہ بعد ہی مغلوں کے حملۂ دکن کے آثار نمایاں ہوئے جن کی بناء پر سلطان عبداللہ نے خداویردی سلطان کو اپنے دربار کے دیگر معزز و ممتاز سرداروں اور امیروں کے ساتھ قطب شاہی سلطنت کی نگرانی اور حفاظت کے لئے متعین کیا۔ لیکن ماہ ذیقعدہ تک جنگ و جدل کے یہ بادل بھی چھٹ گئے اور اسی مہینے میں خداویردی سلطان اور دیگر سپہ سالاران فوج اپنے اپنے متعینہ سرحدی مقامات سے دارالسلطنۃ کو واپس آئے اور میدان وسیع الفضائے دادمحل میں اپنی فوجوں کے ساتھ بادشاہ کو سلام کرنے کی عزت حاصل کی۔ بادشاہ نے ہر ایک کو ان کے رتبہ کے مطابق خلعتیں عنایت کیں اور اپنے اپنے مکانات میں مقیم ہونے کی اجازت دی۔ مورخ لکھتا ہے کہ ان لوگوں کی واپسی کی وجہ سے شہر حیدرآباد ازسرنو معمور ہوگیا۔

اس واقعہ کے چھ ماہ بعد جب صوبہ مرتضےٰ نگر میں کچھ بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو بادشاہ نے بتاریخ ۸ ربیع الثانی ۱۰۴۲ھ خداویردی سلطان کو وہاں کا حاکم منتخب کرکے روانہ کیا۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا جس پر خداویردی سلطان جتنا فخر کرتے کم تھا۔

مرتضیٰ نگر سے واپسی کے بعد بھی وہ بہت سرخرو رہے اور آخر کار ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی اور دائرہ میں دفن کئے گئے۔

میر میراں | خداویردی سلطان کے بعد دوسری قابل ذکر شخصیت میر میراں (بخشی اسداللہ خاں

بخاری) کی ہے یہ اس مغل فوج کے سپہ سالار تھے جو اورنگ زیب کی سرکردگی میں پہلی بار قلعہ گولکنڈہ کے محاصرہ کے لئے آئی تھی۔ لیکن جیسا کہ موسیٰ برج کے کتبہ سے ظاہر ہے کہ

"از قضاء ربانی غلولہ توپ بر وجود میر میراں چناں خورد کہ درہماں مورچہ ہلاک گشتہ وبعد از فوت او بہ روز صلح شد"۔

یہ کتبہ ۱۰۷۷ھ کا ہے۔ کیونکہ اِس کے آخر میں لکھا ہے کہ" بنا بر حکم ہمایوں اعلیٰ باندک زمانے ایں برج عظیم بسعی خاں مومی الیہ (موسیٰ خاں) درسال سنہ ہزار وہفتاد وہفت باتمام رسید"۔ اورنگ زیب کا یہ اچانک حملہ گولکنڈہ جس میں میر میراں مارے گئے ۱۰۶۶ھ کا واقعہ ہے۔ اور دائرہ میں میر میراں کی قبر پر جو کتبہ ہے اس پر ۱۰۷۹ھ درج ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شائد یہ کوئی دوسرے میر میراں تھے۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کے جلوس کی جو قدیم تصویر سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر موجودہ صدر اعظم دولت آصفیہ کے یہاں محفوظ ہے اس میں شاہی ہاتھی کے عقب میں دو امیر گھوڑے پر سوار دکھائے گئے ہیں جن میں سے ایک پر ابوالحسن تاناشاہ اور دوسرے پر میر میراں لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ میر میراں وہی ہوں جن کی قبر دائرے میں شاہ نورالہدیٰ صاحب کی درگاہ کے پہلو میں جانب مغرب واقع ہے اور جس پر وفات میر میراں کا سنہ ۱۰۷۹ھ درج ہے۔

میر زین العابدینؒ دائرے میں ایک قبر کے کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ میر زین العابدین نے ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ زین العابدین سید مظفر کے بھائی تھے یا شاہ ابوالحسن حاجب بیجاپور کے فرزند زین العابدین تھے جو ۱۰۴۲ھ میں طاعون

کے ساتھ سفیر بنا کر گولکنڈہ روانہ کئے گئے تھے۔[1]

میر محمد جعفر ولد میر محمد رضا استر آبادی

انھوں نے بھی ۱۰۳۱ھ میں وفات پائی اور دائرے میں ان کی قبر کا کتبہ اب تک محفوظ ہے۔ یہ میر صاحب کے اعزہ میں سے تھے ان کے والد محمد رضا استر آبادی کے حالات اس کتاب کے صفحات ۱۳۶ تا ۱۲۸ میں درج ہیں۔

وہ علامہ شیخ محمد ابن خاتون کے مدمقابل تھے۔ لیکن سیاسی میدان میں ان سے شکست کھا گئے اور ۱۰۴۵ھ میں خدمت پیشوائی سے معزول کردئے گئے۔ تاہم بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا چنانچہ اپنے پھپیرے بھائی شاہ خوندکار کی جگہ پر ان کو بیٹھنے کی اجازت دی تھی۔ حدیقۃ السلاطین کے الفاظ ہیں :۔

"چوں جناب میر محمد رضا از ملازمان قدیم الخدمتہ این دولت خانۂ عالیہ است بعد از عزل امر معلٰے شد کہ بر جانب چپ اورنگ خسروی بجائے شاہ خوندکار پسر شاہ محمد قرار گیرد" (احوال ۱۰۴۵ھ)

لیکن اس اعزاز کے ساتھ انکا دربار میں قیام کرنا غالباً علامہ ابن خاتون کی سیاسی مصلحتوں کیلئے ناگوار گذرا اور میر محمد رضا آخر کار حیدر آباد سے ہجرت کر جانے پر مجبور ہوگئے لیکن تاریخ میں اس ہجرت کی وجہ پیرانہ سالی بیان کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ میر نے بادشاہ سے مشہد مقدس کو ہجرت کر جانے کی اجازت چاہی اور ۱۰۵۰ھ میں فرزندوں اور جملہ اقربا کے ساتھ حیدر آباد سے روانہ ہوئے۔

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۳۹۔

لیکن راستہ ہی میں بمقام لاہور ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی۔

معلوم ہوتا ہے کہ باپ کی وفات کے بعد میر محمد جعفر حیدرآباد واپس ہو گئے تھے اور یہیں بتیس[۳۲] سال بعد انتقال کیا اور دائرے میں مدفون ہوئے۔

دیگر اصحاب

اس عہد کی دوسری قبروں میں سید علی (متوفی ۱۰۷۳ھ) اور سید ناصر الدین الحسینی مرتضائی (تاریخ ولادت غرہ ذالحجہ ۱۰۳۶ھ اور تاریخ وفات رجب ۱۰۵۹ھ) کے کتبے قابل ذکر ہیں۔

عہد ابوالحسن قطب شاہ میں

میر صاحب کے دائرے میں ابوالحسن تاناشاہ کے چودہ سالہ عہد میں بھی سیکڑوں اصحاب مدفون ہوئے ہوں گے لیکن چند قابل ذکر ہیں جن میں سب سے پہلے مولنا الفتی یزدی ہیں۔

الفتی یزدی

سادات یزد سے تھے۔ عالم و فاضل ہونے کے علاوہ جید شاعر بھی تھے۔ ۱۰۴۲ھ میں ہندوستان آئے اور خان زماں کی سرپرستی حاصل کی چنانچہ اسی کے ساتھ گجرات آئے۔ اور ۱۰۴۵ھ میں گجرات سے حیدرآباد پہنچ کر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں ملازمت حاصل کی۔ بادشاہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور انھوں نے بادشاہ کے حالات میں ایک مختصر کتاب "روائح گلشن قطب شاہی" لکھی جس کو حسب ذیل سات حصوں میں تقسیم کیا۔

(۱) بادشاہ کے اخلاق۔ (۲) محلات و عمارات شاہی۔ (۳) حیدرآباد کی آبادی۔ (۴) جشن ہائے سالانہ۔ (۵) لشکر فیروزی اثر۔ (۶) سبب

تالیف کتاب[1]۔

بقول عبدالجبار خاں یہ کتاب "قلیل اللفظ کثیر المعنیٰ ہے اور اس کی عبارت رنگین اور معانی شیریں ہے" انھوں نے اس میں کے بعض مقامات کی منظوم اور منثور عبارتیں بھی بطور نمونہ شائع کی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ سلطان عبداللہ نے اس کتاب کے صلہ میں الفتیؔ کو سات ہزار ہون عطا کئے تھے۔ چونکہ الفتی ظریف الطبع اور لطیفہ گو تھے اس لئے حیدرآباد کے اکثر مشاہیر و امرا ان کے بڑے قدردان اور مداح تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں چونکہ خاص رسوخ تھا اس لئے اکثر لوگ ان کی سفارش سے کامیاب بھی ہوتے تھے۔ انھوں نے ابوالحسن تاناشاہ کے ابتدائی عہد میں انتقال کیا۔ اور دائرے میں مدفون ہوئے لیکن ان کی قبر کا پتہ نہیں۔

اوحدی | شیخ معین الدین محمد بلبانی سادات حسینی سے شیخ ابوعلی دقاق کی اولاد میں تھے۔ صاحب علم و ہنر اور اہل وجد و حال میں سے تھے۔ محبوب الزمن میں لکھا ہے کہ احمد نگر ہوتے ہوئے حیدرآباد آئے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ نے ان کی بڑی عزت کی۔ اور منصب عمدہ پر ممتاز فرمایا۔ آخر وہ ۱۰۷۹ھ میں[2] حیدرآباد میں فوت ہوئے اور میر کے دائرے میں

---

[1] افسوس ہے کہ مولف ہذا کی نظر سے یہ کتاب نہیں گذری۔ عبدالجبار خاں نے محبوب الزمن صفحہ ۱۶۱ میں اس کا ذکر کیا ہے اور ساتویں رائحہ کا عنوان نہیں لکھا۔ [2] محبوب الزمن میں صفحہ ،، اپر تاریخ غلط چھپ گئی ہے کیونکہ سلطان عبداللہ کا عہد ۱۰۳۵ھ اور ۱۰۸۳ھ کے درمیان گذرا ہے۔

دفن کئے گئے۔ قبر کا پتہ نہیں۔

دوسری قبریں اس عہد کی دوسری قبروں میں ایک خدیجہ خاتون (متوفی ۱۰۵۸ھ) اور دوسری حاجی محمد مہدی ماژندرانی کے کتبے قابل ذکر ہیں۔

قطب شاہی عہد کے بعد یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ دائرۂ میر محمد مومن صرف عہد قطب شاہیہ ہی میں مقبول خاص و عام رہا بلکہ اس سلطنت کے خاتمہ کے بعد بھی اس کی مقبولیت اور احترام باقی رہا۔ چنانچہ قطب شاہی عہد کے بعد ہی اس میں

نعمت خان عالی مرزا محمد نعمت خاں عالی جیسے بلند پایہ شاعر و بذلہ سنج دفن کئے گئے۔ یہ فتح گولکنڈہ کے وقت اورنگ زیب کے ساتھ تھے اور محاصرہ کے تفصیلی حالات قلمبند کئے ہیں۔ ۱۱۲۱ھ میں فوت ہوئے اور میر صاحب کے دائرے میں مدفون۔ عام طور پر مشہور ہے کہ ان کی قبر مقبرۂ میر مومن کے دروازہ سے بالکل متصل واقع ہے لیکن معتبر روایت یہ ہے کہ نعمت خان عالی اُس مسجد کے صحن میں دفن ہیں جو دائرے میں جانب جنوب مغرب واقع ہے۔

عہد آصفی میں شاہان آصفیہ کے زمانہ میں بھی دائرے کی مقبولیت روز افزوں رہی چنانچہ اس سلطنت کے اکثر مشاہیر اس میں مدفون ہوئے۔ مشہور شاعر

عبدالولی عزلت عبدالولی عزلت جو سورت میں پیدا ہوئے تھے اور ہندوستان کے اکثر مشہور مقامات کی سیر و سیاحت کرنے کے بعد حیدرآباد چلے آئے تھے رجب ۱۱۸۹ھ میں دائرے ہی میں دفن کئے گئے ان کی قبر کا اس وقت کوئی پتہ نہیں چلتا

شاہ تجلی علی عہد نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے مشہور مورخ، شاعر، خطاط اور مصور تھے۔ ان کا ذکر اس کتاب میں صفحہ ۲۵ پر بھی گذر چکا ہے۔ میر محمد مومن کی اولاد سے ان کے تعلقات تھے۔ تزک آصفیہ ان کی مشہور تاریخ ہے جس کے صلہ میں ان کو تقریباً ایک لاکھ روپے وصول ہوئے تھے۔ اور خود آصف جاہ ثانی نے ان کی دختر کی شادی میں شرکت کر کے ان کی عزت افزائی کی تھی۔ انھوں نے ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی اور دائرہ میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر کا بھی پتہ نہیں۔

میر عالم نواب ابوالقاسم میر عالم پہلے مملکت آصفیہ کی طرف سے سرکار انگریزی کے پایہ تخت کلکتہ میں سفیر تھے اور بعد کو عرصہ تک مدار المہامی کا کام انجام دیا۔ تدبر و سیاست اور رفاہ خلق کے کاموں میں بڑی شہرت حاصل کی۔ تالاب میر عالم اور بارہ دری حیدر آباد میں ان کی مشہور تاریخی یادگاریں ہیں۔ ان کو شعر و سخن اور علم و فضل سے بھی خاص شغف تھا۔ چنانچہ حدیقۃ العالم ایک مشہور تاریخ انہی کے نام سے منسوب ہے۔ انھوں نے ماہ لقابائی چندا کا ایک سراپا فارسی میں لکھا تھا جو اپنی نوعیت کی ایک خاص نظم سمجھا جاتا ہے۔

میر عالم نے ۱۲۲۳ھ میں انتقال کیا۔ ان کی خواہش تو یہ تھی کہ عاشور خانہ پنجہ شاہ کے صحن میں دفن ہوں چنانچہ وہاں ایک قبر بھی تیار کرالی تھی لیکن نواب آصف جاہ ثالث نے حکم دیا کہ میر صاحب کو میر صاحب کے دائرے ہی میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ وہ وہیں دفن ہیں اور ان کی قبر پر کتبہ اور روشنی کا انتظام حال ہی میں نواب میر یوسف علیخاں سالار جنگ بہادر کی توجہ سے تکمیل کو پہنچا ہے۔

میردوراں

میر ابوالقاسم کے فرزند سید رضی میر دوراں تھے۔ اپنے والد کی زندگی ہی میں ۱۲۱۶ھ میں انتقال کیا اور انہی کی قبر کے پائنتی جانب جنوب مغرب مدفون ہوئے۔ ان کی قبر پر بھی ایک کتبہ موجود ہے۔

مختار الملک کا خاندان

نواب سر سالار جنگ اعظم مختار الملک کے نام سے کون ہے جو واقف نہیں۔ ان کے عہد وزارت میں دائرے کے انتظامات بھی باضابطہ طور پر عمل میں آئے۔ یہاں ان کے خاندان کے مقابر ایک علیحدہ محصورہ مقام پر واقع ہیں۔ اس جگہ ان کے دادا، والد اور چچاؤں اور خود ان کی اولاد کی قبریں نہایت سلیقہ سے بنی ہوئی ہیں۔ اور ان پر ناموں کے چھوٹے چھوٹے کتبے بھی درج ہیں۔

عماد السلطنۃ

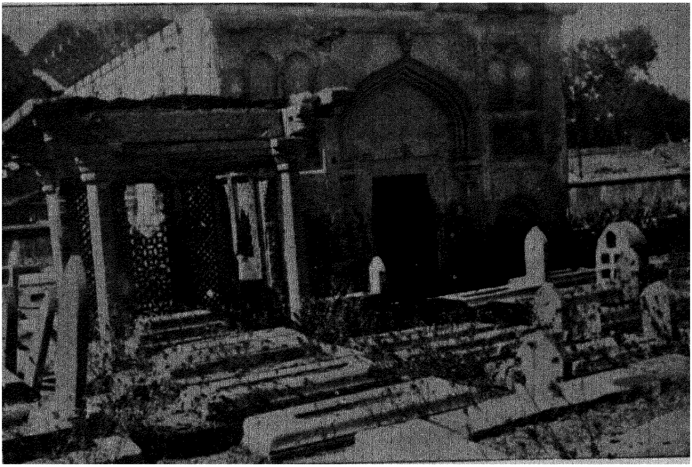
مختار الملک کے فرزند نواب میر لائق علی خاں عماد السلطنۃ کی قبر بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ عماد السلطنۃ بھی وزیر اعظم تھے۔ اور اپنی ذہانت و ذکاوت اور حافظہ و فراست کی وجہ سے دکن کے مدار المہاموں کی فہرست میں خاص طور پر ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۱۳۰۶ھ میں عنفوان شباب میں انتقال کیا اور دائرے ہی میں اپنے خاندانی مقبرہ میں مدفون ہوئے۔ اس مقبرہ کی تصویر اس کتاب میں شامل ہے۔

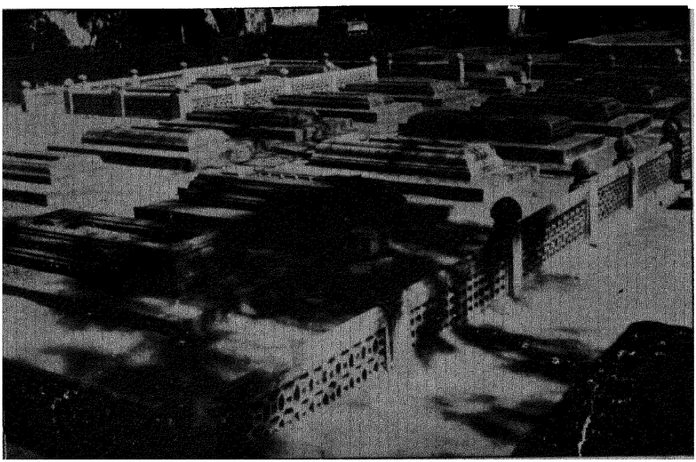
حسام الملک خانخاناں

نواب مختار الملک کے مقبرے کی طرح نواب خانخاناں کے خاندان سے متعلقہ قبریں بھی ایک علیحدہ چار دیواری کے اندر واقع ہیں۔

شہاب جنگ

حیدرآباد کے ایک اور نامور وزیر شہاب جنگ بھی اسی دائرہ میں اپنے اعزہ و اقربا کے ساتھ آسودہ ہیں۔





اوپر۔ میر عالم کا مزار واقع دائرہ میر مومن

[illegible] اصفہانی خاندان کے مزار واقع دائرہ میر مومن

دیگر مشاہیر

عہد آصفی کے دیگر مشاہیر میں شاہ یار الملک، اعتصام الملک عرض بیگی، محبوب یار جنگ ناظم الملک اور میرزا محمد علی خاں المعروف بہ شیر جنگ اور انکے اعزہ و اقربا کی قبریں بھی قابل ذکر ہیں جو اسی دائرے میں زیارت گاہ خواص و عوام ہیں۔

گذشتہ ربع صدی میں اور جو مشہور اصحاب میر محمد مومن کے دائرے میں مدفون ہوئے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

سید علی نقی صاحب قبلہ سنہ ۱۳۵۴ھ۔ میر بہادر علی صاحب صفی سنہ ۱۳۵۷ھ۔ کامیاب جنگ سنہ ۱۳۱۶ف۔ حکیم سید ظہور علی سنہ ۱۳۴۹ھ۔ حکیم سید نثار حسین سنہ ۱۳۳۸ ہجری امداد جنگ سنہ ۱۳۱۳ھ۔ شمشیر جنگ سنہ ۱۳۵۰ھ۔ فتحیاب جنگ سنہ ۱۳۵۲ھ۔ حکمت جنگ سنہ ۱۳۵۶ھ۔

موجودہ حالت

اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع کے عہد میں میر مومن صاحب کے دائرے کے دن پلٹ گئے۔ خود اعلیٰحضرت نے چار سال قبل بروز سہ شنبہ ۱۰ جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۶ھ دائرہ کا معائنہ کیا جس کے بعد سے دائرے کی رونق اور صفائی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ بعض کتبوں میں خود اعلیٰحضرت کے لکھے ہوئے قطعات تاریخی نظر سے گذرتے ہیں۔ جن میں سے نواب مختار الملک کی اور مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری کی جواں مرگ دختر کی تاریخہائے وفات خاصکر قابل ذکر ہیں۔

یہ دائرہ محکمہ امور مذہبی سرکار عالی کے زیر نگرانی ہے اور اس کے انتظامی امور کے لئے ایک مجلس مشاورت مقرر ہے جس کے اراکین میں نواب عنایت جنگ، نواب شہید یار جنگ، مولوی

سید محمد حسین جعفری، مولوی میر محمد حسین فاضل، مولوی میر صادق علی، نواب احمد علیخاں، مولوی میر جعفر علیخاں اور میر عباس علی صاحب سجادہ میر مومن وغیرہ قابل ذکر ہیں اور اس مجلس کے معتمد مولوی سید محمد تقی صاحب جنت ہیں جن کے جوش عمل اور پُرخلوص خدمات نے دائرے کی حالت کو بہت بہتر بنادیا۔ انہی کی سعی سے یہ تاریخی مقام اپنی شایان شان عظمت کا حامل بنتا جارہا ہے۔ ان کو دائرے کے امور سے جو دلچسپی ہے اس کا ایک عملی ثبوت یہ "حیات میر مومن" ہے جو ان کی فرمایش اور اصرار کی وجہ سے مولف کی دوسری زیر ترتیب کتابوں میں سب سے پہلے منظر عام پر آرہی ہے۔

دسواں حصّہ

ضمیمے

اِس حصّے میں کتاب کے مختلف حصص سے متعلق وہ معلومات درج ہیں جو ان حصوں کی طباعت کے بعد مولف کے علم میں آئیں۔ آخر میں کتاب کے ماخذوں کی فہرست اور اشاریہ بھی شریک کر دیا گیا ہے۔

کتاب رجعت میر محمد مومن کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں صفحہ ۹۸ پر لکھا گیا تھا کہ "کتاب رجعت کا کوئی نسخہ اب تک نظر سے نہ گذرا" لیکن تو ابواب چھپ جانے کے بعد اتفاق سے نواب سالارجنگ بہادر کے کتب خانہ میں ایک دوسری کتاب کے ساتھ اس کا قلمی نسخہ بھی نکل آیا جس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ میر صاحب نے رجعت امام کے موضوع پر یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ اس نسخہ میں ۶۰ ورق ہیں اور ہر ورق میں ۲۶ سطریں۔ یہ پوری کتاب عربی میں ہے اور اس کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے:۔

آغاز الحمد علی نعمایۂ۔ والشکر علے الآیہ۔ والصلواۃ والسلام علے نبیہ۔ محمد وآلہ۔ فقد سالنی بعض من لایسعنی ردّہ تالیف مختصر مشتمل علے مسائل الرجعتہ۔ فاستخرجت لہ من کتب المتقدمین من اصحاب المعول علیہا بعض الاخبار المنقولہ عن اصحاب العصمۃ صلوات اللہ علیہم فی الرجعہ فذکرت فی اولہ من احادیث باب التسلیم لہم و الردّ الیہم عما وردعنہم صلوات اللہ علیہم کما قال اللہ تعالےٰ فی محکم کتابتہ فما اشمأزت قلوبکم وانکرتموہ فردّوہ الی اللہ والے رسولہ والے اولے الامر منکم۔ وباللہ توفیق۔

موضوع و طرز ترتیب پوری کتاب میں رجعت ائمہ سے متعلق آنحضرت کی مختلف حدیثیں پیش کی ہیں اور راویوں کے نام احتیاط سے درج کئے ہیں۔ اس طرح امام مہدی موعود علیہ السلام کی دوبارہ آمد کو بذریعہ احادیث ثابت کیا ہے۔ روایت نقل کرنے کی ایک مثال

یہ ہے :-

روی عن محمد بن الحسین ابی الخطاب عن صفوان بن یحیٰی عن داؤد بن فرقد عن زید الشحام

عن ابی عبداللہ علیہ السلام۔

یہ کتاب مکہ معظمہ میں کسی صاحب نے اواخر محرم ۱۰۸۲ھ میں نقل کی تھی۔ چنانچہ اس کے اختتام پر لکھا ہے:-

خاتمہ کی عبارت

فرغ من تالیفہ مولفہ العبد الفقیر الی اللہ الغنی محمد مومن الحسینی الاسترآبادی فی آخر شہر رجب الاصم من شہور عام تسع وستین بعد الالف فی مکہ المشرفہ زاد اللہ شرفاً وتعظیماً۔ الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی محمد وآلہ اجمعین۔ تمہ بالخیر والظفر۔

اواخر محرام الحرام ۱۰۸۹ھ بعد الالف۔

۲

میر صاحب کے دست گرفتہ اصحاب

اس کتاب کے دوسرے حصہ (صفحہ ۵۷) اور تیسرے حصہ (صفحہ ۷۲) اور چوتھے حصے (صفحہ ۱۳۲ تا ۱۴۶) میں ایسے صاحبان علم وفضل کا تذکرہ گزر چکا ہے جو میر صاحب کی سرپرستی اور امداد کی وجہ سے حیدرآباد کے دربار میں رسائی پا سکے اور جن میں بعضوں کا عروج تو محض میر صاحب کی نظر عنایت کا نتیجہ تھا۔ ایسے ہی اصحاب میں سے چند یہ بھی ہیں:-

عشرتی یزدی

شرفاء سادات یزد سے تھے۔ دکن کی شہرت سنکر عین عالم شباب میں یہاں چلے آئے اور چونکہ اعلیٰ درجہ کے خوش نویس ہونے کے علاوہ شاعر اور رنگین کردار بھی تھے اس لئے میر محمد مومن نے سرپرستی کی چنانچہ عشرتی عرصہ تک ان کے سایۂ عاطفت میں خوشحال و

فارغ البال رہے۔ نستعلیق خط نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ اور اپنی خوش کلامی کی وجہ سے مقبول و معروف تھے۔ میر صاحب کی وفات کے تین سال بعد غالباً ۱۰۳۳ھ میں وفات پائی[1] محبوب الزمن میں ان کے کلام کا نمونہ درج ہے۔

علی گل استرآبادی

بڑے عالم و فاضل تھے۔ انکا ذکر صفحہ ۲۸۰ پر بھی گذر چکا ہے۔ محبوب الزمن میں لکھا ہے:۔

"آپ ایران سے میر مومن استرآبادی کی خدمت میں حیدرآباد دکن میں وارد ہوئے میر موصوف نے ہم وطنی کے لحاظ سے آپ کی بڑی عزت و آبرو کی۔ اور بادشاہی منصبداروں میں معزز عہدے پر ملازم کرایا[2]"

اوائی یزدی

میر مومن اوائی سادات یزد سے تھے۔ عالم و فاضل و ادیب کامل تھے۔ فلسفہ و معقول میں اتنی شہرت حاصل کی تھی مگر علمائے ظاہر نے الحاد و دہریت کا الزام لگایا۔ آخرکار تنگ ہوکر ادھیڑ عمر میں ہندوستان کا سفر کیا۔ چندے سورت میں مقیم رہے اور آخر کار حیدرآباد آئے اور اپنے ہم نام میر مومن استرآبادی کی تائید سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بارگاہ میں منصب عمدہ پر فائز ہوئے۔ اور آخر عمر تک قطب شاہی دربار میں خوش و خرم رہے۔ ۱۰۳۰ھ میں میر صاحب سے چار سال قبل وفات پائی۔ نمونہ کلام محبوب الزمن میں درج ہے[3]۔

---

[1] محبوب الزمن صفحہ ۸۴۹ — [2] محبوب الزمن صفحہ ۶۷۶ —

[3] محبوب الزمن صفحہ ۱۷۸ —

۳

میر مومن کی شخصیت

اس کتاب کے چوتھے حصے میں میر صاحب کی شخصیت اور ان کے اثر و اقتدار کے متعلق تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں حکیم مسیح کاشی کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ حکیم رکن الدین مسیح کاشان میں پیدا ہوئے وہ حکیم نظام الدین علی کے فرزند تھے۔

مسیح کاشی

فن طب کے علاوہ سخن سنجی میں بھی اپنی آپ نظیر سمجھے جاتے تھے۔ شاہ عباس ان کی بڑی تعظیم و توقیر کرتا تھا۔ چنانچہ چند مرتبہ ان کے مکان پر بھی قدم رنجہ فرمایا تھا۔ لیکن آخر کار حکیم ایک مناظرہ میں ناراض ہوکر ہندوستان چلے آئے۔ یہاں جہانگیر نے بڑی قدر و منزلت کی۔ دلی سے الہ آباد ہوتے ہوئے حیدرآباد کی سیر کے لئے آئے۔

حیدرآباد میں میر محمد مومن علما و فضلا کے بڑے مشتاق اور منتظر رہتے تھے وہ حکیم صاحب کی آمد کی خبر سنکر ان کی فرودگاہ پر آئے۔ مسیح نے برسم تواضع باشتباہ گلاب شیشۂ شراب میر مومن صاحب پر افشاں کیا۔ یہ بات میر صاحب کے زہد و تقویٰ کے منافی تھی۔ وہ خفا ہوکر اٹھ گئے۔

میر صاحب کی خفگی سے مسیح کاشانی اتنا ڈر گئے[1] کہ انھوں نے ایک ساعت بھی حیدرآباد میں قیام کرنا نامناسب خیال کیا اور فوراً بے نیل و مرام بیجاپور کی طرف روانہ ہو گئے۔

۴

قصبۂ مومن پیٹھ

اس کتاب کے تیسرے حصہ (صفحات ۶۳ تا ۱۰۶) میں میر صاحب کی جاگیر وں

[1] محبوب الزمن صفحہ ۱۰۰۸

اور دیہات کا تفصیلی حال درج ہے لیکن اس اثنا میں ایک اور بڑے گاؤں مومن پیٹھ کے متعلق مختصًا کا موقع ملا جو حیدرآباد سے تقریبًا ۵ میل پر جانب مغرب واقع ہے۔ اس میں ایک مسجد، کئی عاشور خانے اور ایک عیدگاہ قدیم زمانہ کی بنی ہوی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ کہیں کوئی کتبہ موجود نہیں۔ میر صاحب کے ایک گاؤں میرپیٹھ (قریب ظل اللہ گوڑہ) کی طرح اس میں بھی ایک برج ہے جو دیکھ بھال کیلئے بنایا گیا تھا۔ یہ گاؤں اس پختہ سڑک پر واقع ہے جو سداسیوپیٹھ سے وقار آباد کو جاتی ہے۔ وقارآباد سے اس کا فاصلہ تقریبًا ۱۵ میل ہے۔

مومن پیٹھ میں مسلمان بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ وہاں کے باشندوں سے تبادلۂ خیال کرنے سے معلوم ہوا کہ قطب شاہی زمانہ میں مومن نامی کوئی بزرگ تھے جنھوں نے یہ گاؤں بسایا تھا۔ چونکہ اس گاؤں میں کپڑا بننے والے وہ مسلمان آباد نہیں ہیں جن کو مومن کہتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ یہ گاؤں میر مومن ہی کا بسایا ہوا ہو۔

اشاریہ